بسم اللہ الرحمن الرحیم

اللہ کے بابرکت نام سے جو مہربان اور رحیم ہے

کتابیں؛ ارتقائے عہد کا زینہ
ان کی حفاظت کیجئے

ISBN: 978-969-7578-23-8

زیرِ مطالعہ کتاب مصنف شبیر ناقد کے ایما پر شائع کی گئی ہے اور اس کے جملہ حقوق اور ذمہ داری انہی کو مستحسن ہے۔ ادارہ اردوسخن ڈاٹ کام کی ہمیشہ سے یہ کوشش رہی ہے کہ قارئین تک بہترین اور اغلاط سے پاک ادبی مواد پہنچایا جائے اور اس ضمن میں ہر امکانی کوشش کو بروئے کار لایا جاتا ہے تاہم غلطی کی نشاندہی کا خیر مقدم کیا جاتا ہے تاکہ آئندہ اشاعت میں اس کی درستی کی جائے۔ (ادارہ)

ابوالبیان

ظہور احمد فاتح کا منشورِ نظم

(نظمیاتی انتقادی مطالعہ)

شبیر ناقدؔ

urdusukhan@urdusukhan.com www.urdusukhan.com

اردو سخن

شبیر ناقد
معرفت ظہور احمد فاتح، نزد گورنمنٹ کامرس کالج
تونسہ شریف ضلع ڈیرہ غازیخان ۔
فون: 0342-5237636 0333-5066967 0303-9297131

اردو سخن >>>

استحقاق: تمام تصرفات ''شبیر ناقدؔ اور اردو سخن'' کی تحویل میں ہیں

ISBN: 978-969-7578-23-8

عنوان:	ابوالبیان ظہور احمد فاتح کا منشورِ نظم
مصنف:	شبیر ناقدؔ
ناشر:	اردو سخن ڈاٹ کام، پاکستان
نمودِ اول:	ستمبر 2016ء
حرف بین:	محمد شہریار ناصر
سرورق:	ناصر ملک
طباعت:	شیرِ ربانی پریس، ملتان
قیمت:	500 روپے (30 یورو، 35 ڈالر)

urdusukhan@urdusukhan.com www.urdusukhan.com

اردو سخن

آرٹ لینڈ، گرلز کالج روڈ، اردو بازار چوک اعظم (لیہ) فون: 0302-7844094
اسٹاکسٹ: ادارہ فکرو دانش، الحمد پلازہ، اردو بازار لاہور

تقسیم عنوانات

ابوالبیان ظہور احمد فاتح کی حمد نگاری	9
ابوالبیان ظہور احمد فاتح کی نعت نگاری	33
ابوالبیان ظہور احمد فاتح کی شاعری اور اسلامی خدوخال	59
ابوالبیان ظہور احمد فاتح کے ملی احساسات	67
ابوالبیان ظہور احمد فاتح اور ان کی قومی شاعری	78
ابوالبیان ظہور احمد فاتح کے ہاں نقدِ دانش وحکمت	89
ابوالبیان ظہور احمد فاتح کے پیرایۂ شعر میں عمرانی ادراکات	103
ابوالبیان ظہور احمد فاتح کے سخن میں نفسیاتی امکانات	114
ابوالبیان ظہور احمد فاتح کے فلسفیانہ تصورات	126

ابوالبیان ظہور احمد فاتح کے سخن میں رومانی عناصر 141
ابوالبیان ظہور احمد فاتح اور آشوبِ عصر 152
ابوالبیان ظہور احمد فاتح کا طلسماتی اندازِ فکر و فن 158
ابوالبیان ظہور احمد فاتح کے ہاں نظامِ ترکیبات 165
ابوالبیان ظہور احمد فاتح کے تشبیہاتی آفاق 173
ابوالبیان ظہور احمد فاتح کا آئینۂ استعارات 180
ابوالبیان ظہور احمد فاتح کی شعری تمثیلات 187
ابوالبیان ظہور احمد فاتح کا وسیع تر لسانی استخدام 192
ابوالبیان ظہور احمد فاتح کی نظم اور ہیئتی تجربات 201
ابوالبیان ظہور احمد فاتح کی نظم نگاری کا اجمالی جائزہ 217

انتساب

اپنے آموز گارِ ادب ابو البیان ظہور احمد فاتح کے نام

رُلاتا ہے لہو کے مجھ کو آنسو
ترا یہ عذرِ بینائی کا عالم
تری عظمت کے شاہد ہیں یہ سارے
وہ علمی ہوں کہ فنی کارنامے
سدا کرتا ہے تو کارِ معلم
ہے محوِ خدمتِ ابلاغ دائم

ادب میں تیرا درجہ ہے مسلم
ملی ہے تجھ کو میراثِ پیمبر
ہے تجھ پہ خاص فضل ربِ اکبر
جہاں کو دے رہا ہے درسِ ہمت
تری ہستی میں پیغامِ مسرت
سخن میں تیرے رقصاں موجِ فرحت
تلامیذِ ادب کی جان ہے تُو
تری ہستی میں ہے اک گونہ برکت
کتاب اللہ کا ہر علم ازبر
مرا ایمان ہے یہ تیری نسبت
ہے وافر تجھ میں اخلاص و مروت

ابوالبیان ظہور احمد فاتح کی حمد نگاری

اللہ رب العزت جو خالق ذات وصفات بھی ہے اور صانع کائنات بھی جو رازق بھی ہے مالک بھی، جو غفار و ستار بھی ہے اور کریم و رحیم بھی، جس کی نعمتیں بے پایاں اور احسانات بے شمار ہیں۔اس ذاتِ مہربان کا حق ہے کہ اس کے بندگانِ توفیق مآب اس کے حضور حمد وثنا کے نذرانے پیش کریں۔اس کی عظمت کے گن گائیں۔اس کے انعامات پر اس کی اطاعت گزاری کریں۔بطورِ خاص اہلِ سخن اپنے کلام بلاغت نظام میں صدقِ دل سے اس کی توصیف وتعریف کریں۔وہ عظیم ہستی جس نے حسنِ سیرت، حسنِ صورت اور حسنِ صحت سے نوازا، اس کی مدحت نگاری میں کوئی دقیقہ فروگزاشت نہ کیا جائے۔اہلِ فہم و بصیرت نے اس حقیقت کو سمجھتے ہوئے حقِ قدر دانی ادا کرنے کی ہمیشہ کوشش کی۔

اس تناظر میں اگر ابوالبیان ظہور احمد فاتح کے کلام کا جائزہ لیا جائے تو معلوم ہوگا کہ ان کے دل میں اپنے آقا و مولا کی محبت کا سمندر ٹھاٹھیں مار رہا ہے۔ہر چند کہ محبت ان کے سخن کی اساس ہے، رومان ان کے فن کا خاصا ہے، تاہم جب ہم ان کی حمد نگاری کا جائزہ لیتے ہیں تو عشقِ حقیقی کا ایوانِ ہفت ابواب نگاہ کے سامنے آجاتا ہے اور وہ ایک محب والا وشیدا نظر آتے ہیں۔ان کی شیفتگی بھرپور انداز میں نغمہ خواں نظر آتی ہے۔ان کا والہانہ پن مالکِ حقیقی سے ان کی گہری محبت کا ثبوت بن جاتا ہے۔ان کی چاہت اس قدر بہار ساماں اور دل گداز ہے، اس کا اندازہ ان کے حمدیہ اشعار پڑھ کر قاری بہ حسن وخوبی لگا سکتا ہے۔

یوں تو ابوالبیان ظہور احمد فاتح کا ہر شعری مجموعہ اوصافِ ثنا سے مملو ہے، تاہم ان کی ایک پوری

کتاب ''روح ترے مراقبے میں ہے'' کے نام سے ممنون مطبوعہ دسمبر 2005ء تمام وکمال حمدیہ کلام سے آراستہ ہے۔ اگرچہ ان کے بقول حمدیہ سخن پر مشتمل ایک اورمکمل کتاب بھی مستخرج ہوسکتی ہے تاہم ''روح ترے مراقبے میں ہے'' کا حاصلِ مطالعہ ہم اس مقالہ میں ہدیۂ قارئین کررہے ہیں تاکہ ان کے ثنائی تبحر کا اندازہ ہوسکے۔

اولین حمد زورِ بیان سے معمور ہے، وفورِ شوق میں اپنی مثال آپ ہے۔ ذیل میں اس طویل حمد کے چنداشعار قارئین کے ذوقِ جمیل کی نذر ہیں:

آنِ واحد میں اجڑ جاتے ہیں بسنے والے
اور اجڑے ہوئے لوگوں کو بساتا تُو ہے
تو اگر چاہے تو ایوان کھنڈر بن جائیں
پھول ویران مزاروں پہ اُگاتا تُو ہے
دو جہاں اس کے ہیں جو تیری اطاعت کر لے
رشکِ جنت ہے وہ دل جس میں سماتا تُو ہے
تو جو چاہے تو فقیروں کو تونگر کر دے
بادشاہوں کو بھی درویش بناتا تُو ہے
جو اتر جاتے ہیں خوشبو کی طرح خاطر میں
وہ سخن بندۂ فاتح کو سکھاتا تُو ہے

ان اشعار میں مالکِ حقیقی کی قدرتوں اور مشیتوں کے حوالے ہیں کہ جو کچھ بھی ہورہا ہے، وہ آبادی ہوکہ بربادی، موت ہو یا حیات، غم ہو یا خوشی، سب کچھ اس کے ایما پر ہورہا ہے یہاں تک کہ لبِ شاعر پر جوکلام خوش گوار پردعوتِ شیریں دے رہا ہے، وہ بھی اسی کریم ورحیم کا عطیہ ہے۔

آیئے اب اس سے اگلی حمد کے منتخب اشعار ملاحظہ کرتے ہیں:

چمن چمن میرے محسن ظہور کس کا ہے؟
حیاتِ دیدہ وری رنگ و نور کس کا ہے؟
کسی حسیں پہ نہ مائل ہوا تو میں سمجھا
کہ معتقد یہ دلِ ناصبور کس کا ہے؟

رہا ہے کون تری جستجو میں سرگرداں؟
تھکن کے مارے بدن چور چور کس کا ہے؟
ترے بغیر عنایت ہے چار سو کس کی؟
کرم کا سلسلہ نزدیک و دور کس کا ہے؟
مری خطاؤں کے باوصف مینہ عطاؤں کا
ترا نہیں ہے تو مجھ کو غرور کس کا ہے؟

یہ ثنائی سلسلہ ایک بندے کی اپنے آقا و مولا سے بے پایاں محبت کا اظہار ہے۔ اس کی تجلیات اس کی بے لوث محبت، اس کی تلاش و جستجو، اس کی کیفیات کا مظہر جس سے ایمان تازہ ہو جاتا ہے اور چشم تر ہو جاتی ہے۔

آیئے اب ہم ایک اور شہ پارہ تلاوت کرتے ہیں بلکہ اسے اگر حمدیہ سیپارہ کہا جائے تو مناسب محسوس ہوتا ہے:

شام تیرے لیے رمل میں ہے صبح تیرا طواف کرتی ہے
روح ترے مراقبے میں ہے جاں ترا طواف کرتی ہے
میں نے یخ بستہ سرد موسم کو تیرا سچا گواہ پایا ہے
تیری رحمت گناہگاروں کو کیسے زیرِ لحاف کرتی ہے؟
ہوں تری جلوہ ریزیاں جس پر نور افشاں وہ ذات ہوتی ہے
نور کا انعکاس کرتی ہے نور کا انعطاف کرتی ہے
چابیاں ہیں ترے خزانوں کی جو بشکلِ علوم پائی ہیں
تیری قدرت ہی ذہنِ انساں پر نت نیا انکشاف کرتی ہے
موت ہے ناگزیر سچائی جان لیوا ہے خوف دوزخ کا
دل کو فاتح مگر تسلی ہے ذاتِ عالی معاف کرتی ہے

یہ حمدیہ اشعار فنی اور فکری دونوں اعتبار سے بے مثل ہیں۔ دلکش ردیف و قافیہ کا اہتمام، ترکیبات کی جڑت، تشبیہات و استعارات دل نشیں و لاجواب ہیں۔ جذبات و خلوص کا وفور بندے کی اپنے مولا سے عمیق محبت کا شاہدِ عادل ہے۔ علاوہ ازیں آخری شعر میں انعکاسِ نور اور انعطافِ نور جیسی سائنسی

اصطلاحات حمد میں لطف پیدا کرتی ہیں۔

آیئے اب ایک اور حمد ملاحظہ کرتے ہیں جس کا انتخاب حسبِ ذیل ہے:

جو شخص تیری یاد میں ڈوبا نہیں کبھی
وہ تیرے قرب کے لیے تڑپا نہیں کبھی

میری دعا ہو بندگی ہو یا نیاز ہو
جو تیرا حق ہے خلق میں بانٹا نہیں کبھی

ہے وقتِ حمد عالمِ اجلال دیدنی
دل ایسے زور سے مرا دھڑکا نہیں کبھی

پوری مری ضرورتیں تو نے ہی کیں سدا
مانگا ہے تجھ سے غیر سے مانگا نہیں کبھی

اپنے مالک سے مکالمے کی ایک عمدہ نظیر ہے بندہ اور آقا میں کیسی محبت ہونی چاہیے، اس کا اظہار ہے۔ حقوق اللہ اور حقوق العباد میں امتیاز کا تذکرہ ہے، ان کیفیتوں کا ذکر ہے جو عالمِ فنا کے دوران عبدِ مخلص پر وارد ہوتی ہیں۔ سائل کی غیرت اور حاجت رسان و مشکل کشا کی ممنونیت کا ظہار ہے۔ یہ وہ عناصر ہیں جو ایک حمد کا جزوِ لاینفک ہوا کرتے ہیں۔

اب ایک اور حمد پڑھتے ہیں۔ چار اشعار بطورِ انتخاب سپردِ قلم کیے جاتے ہیں:

وہ اپنے ہوں کہ بیگانے تری تسبیح کرتے ہیں
خلائق جانے انجانے تری تسبیح کرتے ہیں

حجر ہوں یا شجر ہوں غیر ناطق ہوں کہ ناطق ہوں
وہ ناداں ہوں کہ فرزانے تری تسبیح کرتے ہیں

جلے جب شمع تو وہ بھی ترا ہی ورد کرتی ہے
مرے فاتح مرے ساقی ہے شاہد قلقل مینا
سبو ، ابریق ، پیمانے تری تسبیح کرتے ہیں

مختلف صوتی تاثرات کو شاعر نے ایک وردِ تسبیح سے تشبیہہ دی ہے اور جو اس کی پسندیدہ آوازیں ہیں، انہیں صداہائے اذکار قرار دیا ہے تا کہ معلوم ہو کہ دنیا کا ہر ذی روح یہاں تک کہ غیر متنفس بھی جزوِ

حلقہء اورادِ الٰہی ہے۔

اللہ رب العزت کے اسماء الحسنیٰ پر مشتمل ایک طویل حمد میں سے بطورِ انتخاب آٹھ اشعار ذیل میں رقم کیے جاتے ہیں۔ دیکھنا یہ ہے کہ سخن ور نے کس خوب صورتی کے ساتھ مالکِ حقیقی کے خوبصورت ناموں کو حمد کی مالا میں پرو دیا ہے۔

وہ ذات رحیم حلیم بھی ہے قدوس کریم عظیم بھی ہے
سبوح بھی ہے سبحان بھی سبحان اللہ سبحان اللہ
ستار شہید رشید بھی ہے غفار حمید مجید بھی ہے
ذوالعرش بھی ذولفرقان بھی ہے سبحان اللہ سبحان اللہ
وہاب قدیر کبیر بھی ہے فتاح بصیر خبیر بھی ہے
ہر جا اس کا فیضان بھی ہے سبحان اللہ سبحان اللہ
رب ظاہر بھی ہے باطن بھی خود مومن اور مہیمن بھی
خود روح بھی ہے خود جان بھی ہے سبحان اللہ سبحان اللہ
وہ باقی اور علی بھی ہے وہ ہادی اور ولی بھی ہے
وہ دانش بھی عرفان بھی ہے سبحان اللہ سبحان اللہ
مصحف تورات زبور اس کا انجیل میں ہے مذکور اس کا
شاہد اس کا قرآن بھی ہے سبحان اللہ سبحان اللہ
کہتے ہیں خدا عجمی اس کو اللہ کہیں عربی اس کو
وہ گاڈ بھی ہے بھگوان بھی ہے سبحان اللہ سبحان اللہ

طویل بحر، مرصع انداز، داخلی قوافی، روانی وسلاست اور اسماء الحسنیٰ کا تسلسل حمد کو شہ پارہ بنا گیا ہے اور یقیناً یہ ابوالبیان ظہور احمد فاتح کی کہنہ مشقی، مہارت اور استادی پر دلالت کرتا ہے۔

لیجئے ایک اور حمد برائے جائزہ حاضر ہے۔ اس میں سے بطور نمونہ تین اشعار تحریر کیے جاتے ہیں:

اے سر نگوں ہو خالقِ اکبر کے سامنے
اے دل حضورِ یاب ہو یاور کے سامنے
یا رب مرے نصیب میں کوثر کا جام ہو

جب حاضری ہو شافعِ محشر کے سامنے

تیری ہی دید کا ہے نگاہوں کو اشتیاق

فاتح میں کیا رکوں کسی منظر کے سامنے

سادہ مگر پراثر اندازِ غیاب میں حضوری کا مزہ اپنے خالقِ باری تعالیٰ کے حضور سپاس گزاریاں، اپنے اعضاو جوارح کو صانع ازلی کے حضور تسلیم ہو جانے کی تلقین سراپا دعا بن کر ساقیٔ کوثر سے حصولِ جامِ کوثر کی سفارش کی استدعا اور آخر میں اس امر کا اعلان کہ محبوبِ حقیقی اور اس کے جمالِ جہاں آرا کے ہوتے ہوئے کسی حسین سے حسین منظر کا نگاہوں میں نہ جچنا باور کرایا گیا ہے۔

بعد ازیں جو حمد جلوہ پاش ہے اس کے انتخاب کے طور پر ہفت اشعار ہدیۂ قارئین کیے جاتے ہیں:

دل جو مخلص ہے مرا آنکھ جو نم ہے سائیں

میں سمجھتا ہوں یہ سب تیرا کرم ہے سائیں

تو نے کچھ ایسی بصیرت سے نواز ہے مجھے

میرے شیشے سے خجل ساغرِ جم ہے سائیں

یہ کسی اور کے آگے نہ جھکا ہے نہ جھکے

سر مرا صرف ترے سامنے خم ہے سائیں

تیری توفیق ہو شامل تو کوئی دیر نہیں

راہِ فردوس تو دو چار قدم ہے سائیں

کوئی منظر نہ جچا میری نگاہوں میں کبھی

سب سے محبوب مجھے تیرا حرم ہے سائیں

تیرا تقویٰ ہے ترا پیار ہے تیرا لحاظ

تیری چاہت ہے مجھے تیری قسم ہے سائیں

بادشاہانِ جہاں ہیں تیرے منگتے یارب

سب پہ حاوی تیرا اجلال و حشم ہے سائیں

جنابِ فاتح اپنی سیرت و صورت میں پائی جانے والی خوبیوں کو مالکِ حقیقی سے منسوب کر رہے ہیں۔ یعنی ہم میں جو جو کوائفِ حسنہ پائے جاتے ہیں، وہ سب آپ کی عطا ہیں۔ وہ اخلاصِ دل ہو یا

تمنا کی ٔ دیدہ، بصیرت ہو یا توحید پرستی، یہ سب تیری عنایتیں ہیں۔ یہاں تک کہ راہِ فردوس بھی تیری برکت سے چار قدم ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہمیں تیرا حرم ہی سب سے زیادہ محبوب ہے اور دیدہ و دل میں ہمیشہ تیرا لحاظ، تیرا خوف اور تیرا پیار بسا ہوا ہے نیز تیری چاہت میں نہال رہتا ہوں۔ کیوں نہ ہوں کہ دنیا کے بادشاہ بھی تیرے گدا ہیں۔ نیز ی تیری جلالت وحشمت سب پر محیط ہے۔ یہاں سائیں کا لفظ بطور ردیف لایا گیا ہے جس کے مختلف زبانوں میں مختلف معانی ہیں لیکن ان کی مادری زبان ''سرائیکی'' میں سائیں مالک کو کہتے ہیں۔ ایسا مالک جس سے گہری جذباتی وابستگی ہو۔

آگے ایک اور حمد دامنِ توجہ کھینچ رہی ہے۔اس کے چند اشعار سپردِ قلم کیے جارہے ہیں:

یہ ترا نور جہاں تاب ہے جس کے باعث
عقل فہمیدہ و دل اہلِ خبر ہوتا ہے
یہ ترا نور ہے جس نور کے باعث انساں
صاحبِ معجزہ و اہلِ نظر ہوتا ہے
یہ ترا نور ہے جس کی پذیرائی ہے
ذرہ ٔ خاک دلِ شمس و قمر ہوتا ہے
یہ ترا نور ہے جس کی ضیا پاشی ہے
قطرہ ٔ آب گراں قدر گہر ہوتا ہے
یہ ترا نور ہے اس کو بھی بناتا ہے ولی
جس کا ہر لمحہ گناہوں میں بسر ہوتا ہے

شاعر بصد عجز و نیاز ثنا پرداز ہے کہ اے مولائے کل! اے نور بداماں ہستی! اے ذاتِ عالی صفات! تیرے نورِ جہاں تاب کا اعجاز ہے کہ عقل میں فہم اور دل میں خبریت ودیعت ہے۔ انسان کو معجزیت و بصیرت حاصل ہے۔ حد تو یہ ہے کہ ترے نور سے سرشار ہو کر ایک خاک کا ذرہ بھی غیرتِ مہر و ماہ بن جاتا ہے۔ تیرے نورِ سراپا طور کی برکت سے قطرہ ٔ نیساں میں اوصافِ گہر پیدا ہو جاتے ہیں۔ اور اس کی چمک دمک دیدنی ہوتی ہے۔ یہاں تک کہ گمراہی میں گھرے ہوئے لوگ اس کی برکت سے کمالِ رہبری پر فائز ہو جاتے ہیں۔ اس حمد کا کمال یہ ہے کہ اس کا ہر شعر نورِ الٰہی کا اک حوالہ ہے اور ہر نورانی چیز کو اس ذاتِ بابرکات سے جوڑ دیا گیا ہے۔

آگے بڑھتے ہیں تو ایک اور شہکارِ عقیدت توجہ اپنی طرف مبذول کرا دیتا ہے۔ اس میں سے تین اشعار آپ کی نذر ہیں:

ہدایت ہاتھ میں تیرے ہے تو جس کو عطا کر دے
کہ گمراہوں کو مہرِ حق پرستی تو ہی دیتا ہے
ہے تیرے دستِ قدرت میں شفا ہو یا ہو بیماری
جگاتا بھی ہے تو نیندیں بھی گہری تو ہی دیتا ہے
جسے چاہے بلا لیتا ہے پیغامِ اجل دے کر
مریضوں کو نویدِ زندگی تو ہی دیتا ہے

رب العزت کی قدرتِ کاملہ کے زیرِ موضوع فاتح جی خالقِ ارض وسما سے ہم کلام ہیں۔ چنانچہ لکھتے ہیں کہ ہدایت پر کسی کا اجارہ نہیں۔ بس تیرے ہی اشارۂ ابرو کی دیر ہے، بڑے سے بڑے گمراہ بھی رو بہ ہدایت ہو سکتے ہیں۔ کسی کو بیمار کرنا ہو، یا بیمار کو شفایاب کرنا ہو، یہ سب تیرے ہی اختیار میں ہے۔ یہاں تک کہ خواب و بیداری بھی تیری ہی دین ہے۔ جسے چاہے تو سلا دے اور جب تو چاہے، بیدار کر دے۔ کسی کو موت سے ہم کنار کرنا ہو یا کسی قریب المرگ کو حیات آشنا کرنا ہو، سب تیرے ہی تصرف میں ہے۔

آمدہ ثنا میں سے بھی تین اشعار کا گلدستہ آپ کے ذوقِ جمیل کی نذر ہے:

وہ شخص خوش نصیب ہے روحِ سعید ہے
ہر فیصلہ وہ جس کو گوارا خدا کا ہے
اس کے رسولؐ کا ہے جو انساں مطیعِ حکم
قرآن کہہ رہا ہے وہ پیارا خدا کا ہے
فاتح اس کے نام سے کر دیجئے نثار
ہے مالک و مال جو بھی ہمارا خدا کا ہے

ان اشعار میں مختلف بندگانِ خدا کی ایمانی کیفیات کی جھلکیاں ہیں جو آخر کار حمد کے پیرائے میں منضبط کی گئی ہیں۔ ایسا انسان سعادت مند ہے جو خدا کے ہر فیصلے پر اظہارِ تسلیم و رضا کرتا ہے۔ ایسا آدمی جو اس کے پیارے نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی فرماں برداری کرتا ہے، قرآن کے حسبِ ارشاد وہ اللہ تعالیٰ کو محبوب ہے

جیسا کہ ارشادِ خداوندی ہے:

ان کنتم تحبون اللہ ما تتبعونی یحببکم اللہ

الغرض ہمارے تصرف میں جو کچھ بھی ہے، وہ حکومت ہو کہ مال و منال، سب کچھ اس پروردگارِ ذیشان کی خدمتِ عالی میں پیش کر دینا ہے۔

ایک اور حمد ہمارے ذوق و شوق میں اضافہ کے لیے جلوہ ء ساماں ہے۔اس کا انتخاب تین اشعار کی صورت میں ہدیہء قارئین ہے:

وہ قدر دان ہے کریں اس سے محبتیں
وہ مہربان ذات ہے اس سے دعا کریں
دل میں رہے یقین وہی بگڑی بنائے گا
وہ ہے وفا شعار ہم اس سے وفا کریں
بخشی سخن وری ہمیں ربِ کریم نے
اشعار اس کی حمد میں فاتح لکھا کریں

والہانہ انداز میں لکھی گئی یہ ثنا قربِ خالق و مخلوق بڑھانے کا باعث ہو سکتی ہے جس میں مالکِ حقیقی کی قدردانی و مہربانی کے باعث اسے مرجع محبت و دعا قرار دیا گیا ہے۔اس کی وفا شعاری کا یہ تقاضا ہے کہ ہم بھی ہمیشہ اس سے وفا کرتے رہیں اور یہ یقین بنائے رکھیں کہ وہی ذات ہی ہماری بگڑی بنائے گی۔اس ربِ کریم نے ہمیں شاعر بنایا ہے تو اس انعام کا بھی یہ تقاضا ہے کہ ہم اس کے حوالے سے مشقِ سخن کریں جس میں اس کی شان بیان کی گئی ہو اور دھیان وابستہ کریں۔

خدائے خبیر و بصیر کی بارگاہِ عالیہ میں اس عقیدت و محبت سے شاعر اپنے قلبی جذبات پیش کرتا ہے۔اس کا اندازہ درج ذیل حمدیہ کلام پڑھ کر بہ حسن و خوبی ہو سکتا ہے:

میرے آقا تیری نگاہ سے تیری کائنات چھپی نہیں
میرا کوئی حال چھپا نہیں میری کوئی بات چھپی نہیں
تو علیم ہے تو خبیر ہے تو حکیم ہے تو بصیر ہے
تیری چشمِ ژرف کے روبرو کوئی واردات چھپی نہیں
تو کہ فاتح دل و جان ہے میرا تجھ سے حسنِ گمان ہے

تیرے رحم کی کوئی حد نہیں تیری التفات چھپی نہیں

بطورِ خاص مقطع محلِ نظر ہے۔ شاعر خود فاتح ہونے کے باوجود یہ خطاب اپنے آقا و مولا کو دے رہا ہے اور حسنِ گمان کے حوالے سے عمدہ امید کا اظہار کر رہا ہے کہ وہ اس کے حق میں بہتر فیصلہ فرمانے والا ہے۔

اس سے آگے والی ثنا ''ساقیء جاں آفریں کے حضور'' کے زیرِ عنوان ہے، بے حد سادہ و سلیس ہے۔ یہ حمد ایک جہانِ ایمان اپنے اندر سموئے ہوئے ہے۔ اس میں سے پانچ اشعار آپ بھی ملاحظہ کریں:

تیری سجدہ ریزی میں گزرے ہمیشہ
مری صبح ساقی مری شام ساقی
ترے ہجر کے درد میں جو ہے بسمل
وہ دل تھام ساقی جگر تھام ساقی
وہ نادان ہیں جو ہیں مایوس تجھ سے
بہر سو ترا لطف ہے عام ساقی
تجھے جو بھی کہتے ہیں بے عدل و ظالم
وہ ظالم لگاتے ہیں الزام ساقی
اگر شاملِ حال تیری مدد ہو
تو میں ہو نہیں سکتا ناکام ساقی

ساقی کہہ کر ربِ رحمان کو مخاطب کرنا اگرچہ ایک گونہء جسارت ہے مگر اس میں بھی طہارت کارفرما ہے۔ وہ ربِ رحیم و کریم ہر اعتراض سے ماورا ہے۔ لہٰذا اس کی نسبت کشائی کرتے ہوئے احتیاط ناگزیر ہے۔

توحیدِ ربانی ایسا موضوع ہے جسے ہم جانِ ثنا کہہ سکتے ہیں۔ جو حمد آگے جلوہ ریز ہے، اس میں بھی یہی کیفیت پائی جاتی ہے۔ تین اشعار ملاحظہ ہوں:

کوئی ہم سر نہیں تیرا یا رب
ایک تو بندگی کے لائق ہے
ساری تعریفیں تجھ کو سجتی ہیں

تو ہی اعلیٰ ہے تو ہی فائق ہے
جس کو شک ہے تری خدائی پر
کتنا ظالم ہے کتنا فاسق ہے؟

شعرِ اول میں خدائے بزرگ و برتر کی وحدانیت اور اس کے لاشریک ہونے کا اعتراف کیا گیا ہے۔ شعرِ ثانی میں اللہ تعالیٰ کے فائق و اعلیٰ ہونے کے حوالے سے مدح کی گئی ہے اور کہا گیا ہے کہ تمام تر تعریفیں اس ذات کو زیبا ہیں۔ تیسرے شعر میں شاعر نے واشگاف لفظوں میں اعلان کر دیا ہے کہ اس سے زیادہ ظالم و فاسق کون ہو سکتا ہے جو اپنے معبودِ حقیقی کے بارے میں مبتلائے اشتباہ ہو۔

آیئے، اب ایک اور حمد پڑھتے ہیں۔ یہ حمد گویا صفاتِ باری تعالیٰ کا ایک دلکش مرقع ہے۔

خدائے پاک کو زیبا ہے شاہی سب زمانوں کی
اسی کے ہاتھ میں ہی چابیاں ہیں کل خزانوں کی
وہی حاکم بھی ہے عادل بھی ہے خلاقِ عالم بھی
اسی کے سامنے خم ہیں جبینیں حکمرانوں کی

تاریخِ ازمنہ شاہد ہے کہ وہی مالکِ حقیقی ازلی فرماں روائے عالم رہا ہے اور تا ابد رہے گا اور یہی اس کے شایانِ شان ہے کیونکہ خزائنِ جہاں کی تمام چابیاں اسی کے ہاتھ میں ہیں اور وہ اپنے حسبِ منشا تصرف کرتا ہے۔ سب سے بڑا انصاف کرنے والا بھی وہی ہے۔ حکومت بھی اسی کی آفاق و انفس پر اور تاجِ خلاقیت بھی اسی کے سر سجتا ہے۔ جہاں کے تمام حکمران اسی کے حضور سربسجود ہوتے ہیں۔

ابوالبیان نے ہر رنگ میں حمد باری تعالیٰ کہی ہے۔ یہ ان کا انداز نہایت پر تکلف اور پرشکوہ ہے اور کہیں یہ رنگ بہت سادہ ہو جاتا ہے۔ اسی اسلوب کی حامل ایک حمد کے دو شعر ہدیۂ قارئین ہیں:

خاک سے پیدا کیا ہے تو نے اس انسان کو
اور بخشے ہیں اسے تو نے دماغ و قلب و جاں
ہم ترے بندے ہیں یا رب اور تو معبود ہے
ہم خطا پیشہ ہیں آقا اور تو ہے مہرباں

قرآن مجید میں فرمانِ باری تعالیٰ ہے کہ ہم نے انسان کو مٹی سے پیدا کیا۔ اسی نسبت سے صنعتِ تلمیح شعرِ اول میں لائی گئی ہے اور اس کی خلاقیت حکیمانہ کے حوالے سے انسانی دل و دماغ اور جسم و جاں کی

تخلیق یقیناً صانعِ حقیقی کا شاندار کارنامہ ہے۔ اس کے ساتھ ہی اپنی مخلصانہ عبودیت اس معبودِ حقیقی سے وابستگی کا انعام اور اس کے ساتھ اپنی خطا کاری کا اعتراف نیز رب العزت کی مہربانیوں کا تذکرہ ہے۔

سلسلۂ ثنا آگے بڑھتا ہوا اس مقام پر پہنچتا ہے۔ چار منتخب اشعار آپ کی نذر ہیں:

مجھے جاں سے بھی پیارا ہے ترا پیغمبرِ عالمؐ
مری آنکھوں کی ٹھنڈک ہے ترا قرآن یا اللہ
مری اس سے زیادہ خوش نصیبی اور کیا ہو گی
اگر ہو جاؤں تیری راہ میں قربان یا اللہ
سمندر روشنائی ہوں شجر سب خامہ بن جائیں
بیاں پھر بھی نہ ہو پائے تری یہ شان یا اللہ
بھٹکتا پھر رہا ہوں میں کج و پرخار راہوں میں
عطا کر مجھ کو سیدھی راہ کی پہچان یا اللہ

پہلا شعر قرآن مجید اور حاملِ قرآن پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے والہانہ محبت کا اظہار کا حامل ہے۔ یہ اس لیے کیا گیا ہے کہ اول الذکر اللہ کا رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور ثانی الذکر اللہ کی کتاب ہے۔ حبِ الٰہی اس درجہ شدید ہے کہ وہ اپنے آقا و مولا پر فدا ہو جانے کو اپنی انتہائی خوش نصیبی سمجھتے ہیں۔ تیسرا شعر قرآنی صنعتِ تلمیح کا حوالہ ہے جیسا کہ خود رب العزت فرماتے ہیں کہ اگر سارے درخت اقلام بن جائیں اور تمام سمندر روشنائی ہو جائیں تب بھی کلماتِ الٰہی ختم ہونے کے نہیں۔ چوتھا شعر صرف دعا ہے۔ شاعر عرض کناں ہے کہ یا اللہ میں دشوار و پرخار راہوں میں کب سے بھٹک رہا ہوں، براہِ کرم اب تو صراطِ مستقیم پر چلا دے کہ یہی ایک بندے کا منتہائے مقصود ہے۔

آگے چلتے ہیں؛ ایک اور حمد بھرپور انداز میں جلوہ ساماں ہے۔ بطورِ انتخاب پانچ اشعار آپ بھی پڑھیے:

یہ بجا بیٹھا ہوا عرشِ بریں پر تو ہے
جلوہ امروز مری روح کے اندر تو ہے
ہے ترے نام سے منسوب عبادت تیری
میرا معبود ہے تو اعلیٰ و برتر تو ہے

تیری رحمت ہے ترے قہر پہ حاوی یارب
مطمئن میں ہوں مرا داورِ محشر تو ہے
ہے ترے نام کی نسبت سے مری نذر و نیاز
محترم سب سے ہے تو سب سے موقر تو ہے
تجھ کو پانے کی طلب تو ہے دلِ فاتح میں
ماورا سوچ سے ادراک سے باہر تو ہے

1۔اے رب دو جہاں!اس میں کوئی شک نہیں کہ تو عرش پر متمکن ہے، تیری قدرتیں لامحدود ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ بیک وقت جملہ امور کی انجام دہی کے باوجود میرے دل پر بھی تو حکومت فرما رہا ہے۔

2۔میری تمام تر عبادت صرف اور صرف تیرے لیے ہے کیونکہ تو ہی اعلیٰ و برتر ہے۔اس لیے تو ہی معبودِ حقیقی ٹھہرا ہے۔

3۔اگرچہ تو رحمان کے ساتھ ساتھ قہار بھی ہے لیکن تیری رحمت ہر شئے سے وسیع ہے۔اسی وجہ سے میرا دل مطمئن ہے کہ میرے ساتھ قیامت میں کوئی ناانصافی نہیں ہوگی کیونکہ داورِ محشر تجھ جیسی منصف و مہربان ہستی ہوگی۔

4۔اے مالکِ کل!میری مالی عبادات ازقبیل نذر و نیاز بھی صرف تیرے لیے ہیں کیونکہ تو ہی سب سے زیادہ لائقِ احترام ہے اور تو ہی سب سے بڑھ کر پروقار ہے۔

5۔اس کے باوجود کہ تیری ذاتِ پاک ادراک سے ماورا اور سوچ سے باہر ہے، پھر بھی تیری لگن من میں سمائی ہے۔تیری جستجو کوبہ کو لیے پھرتی ہے۔تجھے پانے کی ایسی چاہت ہے جو ناقابلِ بیان ہے۔

ابوالبیان ظہور احمد فاتح نے حمد میں کامل خودسپردگی، والہانہ پن اور تسلیم و رضا کا اظہار عقیدت مندانہ انداز میں رب العزت کے حضور یوں کیا ہے کہ یہ حقیقی محبت کا ایک روپ محسوس ہوتا ہے۔

ایک اور حمد کے تین شعر ملاحظہ ہوں:

نظر سے اوجھل ہے اور تو روح میں عیاں ہے
سمجھ نہ آئے یہ دوریاں ہیں کہ قربتیں ہیں
یہ محض لطفِ کرم ہے تیرا کہ تو ہے راضی
عبادتیں ہیں نہ پاس میرے ریاضتیں ہیں

جو تجھ سے غافل ہیں کاش فاتح عیاں ہوں ان پر
کہ تیرے ذکرِ جمیل میں ہی حلاوتیں ہیں

شعرِ اول میں صنعتِ تضاد کا دہرا استعمال لطف پیدا کر رہا ہے۔ تیرا نظر سے نہاں اور دل میں عیاں ہونا ایک معمہ بنا ہوا ہے اور کچھ یقین سے نہیں کہا جا سکتا کہ یہ دوریاں ہیں یا قربتیں ہیں۔ شاعر کسرِ نفسی سے کام لیتے ہوئے اظہارِ عجز کر رہا ہے کہ اپنا حال تو یہ ہے کہ نہ تو کوئی خاص عبادتیں تیری خوشنودی کے لیے کی ہیں اور نہ زیادہ ریاضتیں تیرے تقرب کے لیے کی ہیں، اس کے باوجود بھی یوں لگتا ہے کہ تُو ہم سے راضی ہے۔ یہ محض تیرا لطف و کرم ہے ورنہ من آنم کہ من دانم۔ شعر ثالث میں ایک بھید کھولا گیا ہے۔ اس حقیقت سے پردہ کشائی کی گئی ہے کہ اللہ کے ذکرِ جمیل میں ہی راحت و فرحت اور مٹھاس ہے۔ اسی میں لطفِ حیات مضمر ہے۔ اسی میں رازِ نجات پنہاں ہے۔ کاش غافلوں کو اس کی خبر ہو جائے۔

ایک تاکیدی نوعیت اور رقصاں بحر کی ثنا درِ دل پر دستک دے رہی ہے۔ تین منتخب اشعار آپ کی نذر کیے جاتے ہیں:

یہی تو مقصدِ زندگی ہے خدا کے بندے خدا خدا کر
گزار جیون سدا اسی کے حضور میں سر جھکا جھکا کر
یہ رنگ و رامش، یہ رقص و مستی، یہ نغمہ و مے ہے کارِ شیطاں
نواز ہردم سماعتوں کو کلام اس کا سنا سنا کر
وہ درد و غم ہو کوئی الم ہو نہ لانا لب پہ کبھی شکایت
وہ تیرا پندار دیکھتا ہے جلا جلا کر بجھا بجھا کر

قرآن مجید میں اللہ رب العزت نے فرمایا ہے کہ ہم نے جنوں اور انسانوں کو محض اپنی بندگی کے لیے پیدا کیا ہے۔ اسی قرآنی تاکید کو بروئے کار لاتے ہوئے جنابِ فاتح اصرار کر رہے یں کہ خدا کے بندے! مقصدِ زندگی تو محض یہی ہے کہ اپنے خدا کو یاد کیا جائے اور زندگی مالکِ حقیقی کے حضور سجدہ ریزیوں میں بسر کی جائے۔ دنیا کی ہر چیز فانی ہے اور اچھے اعمال لافانی ہیں۔ لہٰذا کارہائے دنیا کے لیے کارہائے زریں کو ترک نہیں کرنا چاہیے۔ اچھا شاعر وہ ہے جو کلام اللہ کو سب سے زیادہ اہمیت دیتا ہے اور اس کے فروغ و اشاعت کا اہتمام کرتا ہے۔

یہ جہاں دارالامتحان ہے۔ قدم قدم پر آزمائشیں سر اٹھائے کھڑی ہیں اور قدرتِ کاملہ انہی آزمائشوں

کے ذریعے اپنے بندے کو پرکھتی ہے۔لہٰذا کامیاب ہے وہ شخص جو قدرت کے امتحانوں میں کامیاب ٹھہرتا ہے۔

ایک شعر آمدہ ثنا میں دل کھینچ رہا ہے:

کاٹ دیتی ہے جو حالات کی زنجیروں کو
غیر مرئی سی وہ شمشیر ترے ہاتھ میں ہے

اللہ تعالیٰ نے حضرتِ انساں کو عموماً اور بندۂ مومن کو خصوصاً ایسی شمشیرِ عزائم ودیعت کی ہے جو حالات کی زنجیروں کو کاٹ کے رکھ دینے کی استعداد رکھتی ہے یعنی غیر محسوس، غیر مجرد یہ نظر نہ آنے والے انداز میں عواملِ کائنات اور مظاہرِ فطرت رو بہ کار ہوتے ہیں۔ یہ قوتِ ایمانی کا معجزہ اور کارنامہ ہے۔

ایک اور شعر اگلی حمد میں سے ملاحظہ ہو:

تیری قدرت سے ہے دنیا کے نوادر کی بقا
تیری قدرت سے ہی جچتی ہے کمالات کی بات

اے مالکِ حقیقی! جہاں میں ندرتیں ہیں۔ان کی بقا بھی تیرے دستِ قدرت میں ہے اور جس کو جو قدرتیں حاصل ہیں، وہ بھی تیری قدرت کی ودیعت کردہ ہیں۔یعنی مالکِ حقیقی وہ عظیم ہستی ہے جس کی بدولت نوادرات وکمالات کو اس کی دی ہوئی توفیق سے عروجِ ہنر حاصل ہوتا ہے اور اس کی بخشش ہویی۔ حسیات نادرہ کاری کا باعث بنتی ہیں۔

آیئے اب ایک اور حمد کے دو شعر دیکھتے ہیں:

اس کی یادِ عطر افشاں روح میں آنے لگی
دل میں اھلاً و سہلاً مرحبا ہونٹوں پہ ہے
جو بیاں بھی لب پہ آیا ہے ہوا ہے کارگر
کون جانے اسمِ اعظم کون سا ہونٹوں پہ ہے؟

کوئی ہستی جس قدر عظیم وجلیل ہوتی ہے، اس کی یاد بھی اسی قدر وقیع وکبیر ہوتی ہے۔لہٰذا اس یاد کی گلشنِ دل میں آمد لائقِ صد تحسین ہوتی ہے۔ چنانچہ ظہور احمد فاتح اسے مرحبا صد مرحبا کہہ رہے ہیں کیونکہ وہ مالکِ حقیقی ہی سے متعلق ہے حمدِ باری تعالیٰ وہ اسمِ اعظم ہے جس کے ہوتے ہوئے لب پر آنے والا ہر سخن کارگر ہوتا ہے اور براہِ راست دلوں پر اثر انداز ہو جاتا ہے۔

آمدہ حمد کا ایک شعر جو دعائیہ نوعیت کا ہے، لائقِ اعتنا ہے:

بچانا مجھے شرک سے سرکشی سے
تیری ذاتِ عالی سے میری دعا ہے

ہر صاحبِ دانش انسان اس امر سے بخوبی آشنا ہے کہ شرک ایک ایسا روگ ہے جو انسان کے لیے نہایت مہلک اور خوف ناک ہے جس کے باعث وہ کہیں کا نہیں رہتا۔ لہٰذا وہ اس سے بچنے کے لیے دست بدعا ہیں۔

دو اور شعر ایک حمد کے دامنِ دل کھینچ رہے ہیں۔ دیکھیے گا ان میں سے کس قدر وفورِ شوق وذوق اور ثنائی کیفیات موجود ہیں اور کس طرح عوام الناس سے مخاطب ہو کر لب کشائی کر رہے ہیں:

سنو لوگو! تمہارا ایک رب ہے عظمتوں والا
وہ خالق ہے وہ رازق ہے وہی ہے وسعتوں والا
وہی حاجت روا بھی ہے وہی مشکل کشا بھی ہے
اسی سے مانگ لوں فاتح وہی ہے نصرتوں والا

عوام کو مخاطب کرتے ہوئے وہ ترغیب دلا رہے ہیں کہ ہمیں اپنی احتیاجات کے لیے اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کرنا چاہیے کیونکہ وہی داتا ہے، وہی حاجت روا ہے، وہی مشکل کشا ہے اور وہی نصرف فرمانے والا ہے۔ بقول راقم الحروف:

کبھی مشکلیں جس نے دیکھی نہ ہوں
اسے اپنا مشکل کشا کیجئے

لطف کی بات یہ ہے کہ یہ اندازِ تخاطب کتاب اللہ، احادیثِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور خطباتِ عالیہ میں بھی پایا جاتا ہے۔

ایک اور حمد کے دو مزید شعر دیکھیے:

تو سمجھ آتا نہیں
ذہن ہو جاتا ہے شل
ہاتھ میں شمشیر ہو
اور قرآن در بغل

اللہ کے معنی ہیں ایسی ہستی جس کے بارے میں سوچتے سوچتے اذہان عاجز آ جائیں۔اسی اسمِ ذات کا حوالہ پہلے شعر میں ہے جبکہ دوسرے شعر میں ایک مجاہدانہ تمنا ایک صحابیانہ آرزو، اک صالحانہ خواہش مچل رہی ہے کہ ہمارے روز و شب اس طرح گزریں کہ اعلائے کلمۃ اللہ کے لیے ہاتھ میں تلوار ہو اور حیات کو منور و معتبر کرنے کے لیے بغل میں قرآن کریم ہو۔ یہ حمد چھوٹی بحر، بحر رمل مربع محذوف میں کہی گئی ہے جس کا وزن فاعلاتن فاعلن ہے۔جس کی ادائیگی لطف پیدا کر رہی ہے۔

ابوالبیان ظہور احمد فاتح نے حمدیہ شاعری میں کئی ہیئتی تجربے کیے ہیں مثال کے طور پر آگے آنے والی حمد انہوں نے ثلاثی کے انداز میں کہی ہے:

یہ ہوا یہ خلا تیری قدرت سے ہے
یہ فضا یہ گھٹا تیری قدرت سے ہے
سب جہاں اے خدا تیری قدرت سے ہے

اس بندِ ثلاثی میں شاعر اللہ تعالیٰ کی قدرتِ کاملہ کی نسبت رقم طراز ہے چنانچہ دنیا میں جو کچھ بھی وقوع پذیر ہو رہا ہے، اللہ کی قدرت کا مظہر ہے۔ ہوا ہو، یا گھٹا، فضا ہو یا خلا ہر ایک میں رب العزت کی قدرتیں کارفرما ہیں۔

دو اور شعر آئندہ ثنا کے ملاحظہ ہوں:

اللہ آقا اللہ مولا اللہ پاک ہی داتا
ایک وہی ہے جو ہے سب کے بگڑے کام بناتا
قادر، ناصر، مالک، خالق، رازق، صمد، معاون
اس کے حکم سے چلیں ہوائیں وہ ہے مینہ برساتا

اللہ تعالیٰ کی ذاتِ بابرکات حاملِ ستودہ صفات ہے۔ تمام تر اختیارات اسی کے پاس ہیں۔ وہ مالک الملک ہے۔بگڑی بنانے والا ہے۔ بارشیں برسانے والا ہے۔ وہی قادرِ مطلق ہے۔ وہی ناصر العباد ہے۔لہٰذا اس کی مدح و ستائش ہی بندے کو کرنی چاہیے۔مختصر پیرائے میں جس تسلسل اور جامع انداز میں ثنائے ربِ دو جہاں کی گئی ہے، یہ یقیناً ابوالبیان ظہور احمد فاتح کا ہی خاصا ہے۔

مالکِ حقیقی پر توکل اور بھروسے کا حامل ایک اور حمد کا یہ شعر کس قدر ایمان افروز ہے:

فاتح ملا ہے اس کی کفالت کا لطفِ خاص

جس وقت دست کش ہوا میں ہر کفیل سے

یعنی جب سہارے ترک کر دیے جائیں، ہر آسرے سے منہ موڑ لیا پھر اللہ تعالیٰ کی مدد و نصرت کے مزے لیے ہیں۔بقول راقم:

سہارے یہ سب عارضی سے ہیں ناقدؔ
سہارا ہے اک ان سہاروں سے آگے

بقول محمد علی جوہر:

توحید تو یہ ہے کہ خدا حشر میں کہہ دے
یہ بندہ دو عالم سے خفا میرے لیے ہے

شاندار آدرش کے حامل ایک حمد کے دو اور شعر دامنِ توجہ اپنی طرف مبذول کرا رہے ہیں:

وہی معبودِ واحد ہے جہاں کا
نہ دیوی ہے نہ کوئی دیوتا ہے
مزاروں سے بتوں سے کچھ نہ مانگو
وہی رازق وہی حاجت روا ہے

ایسا لگتا ہے کہ شاعرِ شیریں نوا نہیں بلکہ ایک خشک وہابی ملا کا خطبہ ہے جو شرک کے خلاف محاذ کھولے ہوئے ہے، جھنجھوڑ جھنجھوڑ کر لوگوں سے کہہ رہا ہے کہ سنو سنو وہی ایک اللہ ہی زمانے کا واحد معبود ہے، کوئی دیوی یا دیوتا اس قابل نہیں کہ اس کی پرستش کی جائے۔ بت پرستی اور قبر پرستی سے باز آ جاؤ کیونکہ روزی رسان اور قاضی الحاجات صرف ایک اللہ کی ذات ہے۔مزار پرستی کے حوالے سے اقبال کچھ یوں گویا ہیں۔اس حوالے سے انہوں نے سخت تنبیہہ کا انداز اختیار کیا ہے:

نذرانہ نہیں سود ہے پیرانِ حرم کا
ہر خرقۂ سالوس میں پوشیدہ مہاجن

عالمانہ شان کے حامل دو اور ثنائی اشعار ملاحظہ ہوں:

ہو نثار تیرے حضور جاں تجھے کہہ رہے ہیں جو لامکاں
نہیں سوچتے تیرے حمد خواں کہ تیرا مکاں سرِ عرش ہے
تیرے بس میں سارا جہان ہے تو ہی فاتحِ دل و جان ہے

بڑی آن بان ہے شان ہے سرِ آسماں سرِ عرش ہے

شعرِ اول ایک عمومی حنفی تصور کی نفی کرر ہا ہے۔شاعر کہتا ہے کہ میرے مالک! تجھ پر میری جان نثار ہو، کیا لوگ ہیں جو تجھے لامکاں قرار دے رہے ہیں۔اپنے لیے تو انہیں گھر پسند ہے اور تیرے لیے بے گھرے کے فتوے دے رہے ہیں۔ تیری تعریف کرنے والوں کو یہ معلوم ہونا چاہیے کہ تیرا ایک خاص مقام ہے اور وہ عرشِ بریں ہے۔تو عظیم کرسی پر تشریف فرما ہے۔لہٰذا ان نادانوں کو چاہیے کہ اپنا تصور درست کرلیں۔شعرِ ثانی ایک شعری مرقع ہے جس میں اندرونی قوافی خوب شان دکھا رہے ہیں کہ وہ مالکِ عرش نشیں وہ ذاتِ فلک زیب فاتحِ دل و جان ہے وہ مقتدرِ ہمہ جہان ہے،اس کی بڑی شان اور آن بان ہے۔

ایک اور حمد کے دو شعر سطحِ ایمان بلند کرتے ہوئے محسوس ہورہے ہیں:

ازل سے ناز ہے تیری عنایتوں پہ ہمیں
رہا یقین کرم کی حکایتوں پہ ہمیں
کیا ہے اپنا ہی نقصان تجھے خفا کر کے
عمل ضروری تھا تیری ہدایتوں پہ ہمیں

پہلے شعر میں جو دراصل حمد کا مطلع بھی ہے، جنابِ فاتح مالکِ حقیقی کے حضور نیاز گزار ہیں کہ ہم بندگانِ عاجز ازل سے تیرے الطاف وعنایات پر نازاں ہیں۔تیرے فضلِ جلیل کی جتنی کہانیاں بھی مشہور ہیں، ہم صدقِ دل سے ان کا یقین رکھتے ہیں جبکہ دوسرے شعر میں وہ اظہارِ ندامت کرتے ہوئے ملتمس ہیں کہ ہم نے تیری نافرمانیاں کر کے اپنا بہت سا نقصان کرلیا ہے۔ہمیں چاہیے تھا کہ تیری مہربانیاں حاصل کرتے اور طالبِ خوشنودی ہوکر تیری مہربانیاں حاصل کرتے۔

سپاس گزاری کے جذبات پر مشتمل ایک حمد کا یہ شعر کس قدر دلنشیں ہے:

لاکھ لب ہوں میرے ہر لب ہو تشکر گستر
تیرے صدقے تیرے قربان کرم ہے تیرا

شاعر اپنے آقائے کریم سے مخاطب ہے کہ جی چاہتا ہے کہ تجھ پر قربان ہوجایا جائے تجھ پر جان فدا کردی جائے کیونکہ تیری مہربانیاں بے حد وحساب ہیں۔جی چاہتا ہے کہ ہزار زبانیں ہوں اور ہر زبان ہمہ وقت محوِ ثنا رہ جائے۔

ابوالبیان ظہور احمد فاتح نے حمد کے میدان میں بھی ہیئت کے اعتبار سے بہت سے تجربے کیے ہیں۔ ذیل میں ان کی ایک آزاد نظم میں سے کچھ حصہ رقم کیا جاتا ہے۔ ایسی آزاد نظم جس پر پابند نظمیں بھی قربان ہیں:

بس ہمیں چاہیے صرف اور صرف تیری عبادت کریں
تیرا سا جھی کسی کو بنائیں نہیں
غیر کے سامنے سر جھکائیں نہیں
جز ترے دوسروں کو بلائیں نہیں
ہم کریں غیر سے التجائیں نہیں

گویا جوشِ بندگی میں وہ اوروں کو بھی حسنِ عبادت کے آداب سکھا رہے ہیں کہ ہمیں صرف اور صرف اپنے مالکِ حقیقی کی عبادت کرنی چاہیے۔ کسی اور کے سامنے سرنگوں نہیں ہونا چاہیے۔ اللہ کے سوا کسی اور کو پکارنا نہیں چاہیے اور نہ کسی کے حضور اس قدر نیازمندی سے التجا کرنی چاہیے۔

ایک اور آزاد حمد یہ نظم کا کچھ حصہ ملاحظہ کریں:

کس قدر مہر و محبت سے یہ فرماتا ہے تو
اے مرے بندے نہ ہو مایوس رحمت سے مری
وہ تو کافر ہیں مری رحمت سے جو مایوس ہیں

فاتح صاحب اپنے مالکِ حقیقی سے مخاطب ہیں کہ تو تو خود یہ بات فرماتا ہے کہ اے میرے بندے میری رحمت سے مایوس نہ ہو، اپنی امیدیں میری ذات سے وابستہ رکھ کیونکہ میں تیری امیدیں بر لانے والا ہوں۔ میری رحمت سے تو کافر مایوس ہوتے ہیں۔ دراصل یہ ایک قرآنی تلمیح ہے جیسا کہ کلام پاک میں ارشاد ہوا ہے ''اللہ کی رحمت سے مایوس نہ ہو۔- سورۃ یوسف میں بھی اسی قسم کا ارشاد باری تعالیٰ ہے ''اللہ کی رحمت سے مایوس نہ ہونا۔- اللہ کی رحمت سے کافر ہی مایوس ہوتے ہیں۔

لیجئے اسی حمد کا اختتامی شعر دیکھیے:

مسئلہ کوئی ہو کرتا ہوں دعا تیرے حضور
ہر مصیبت میں ہے میری التجا تیرے حضور

للّٰہیت اور توحیدِ خاص کا حامل ایک اور ثنائی شہ پارہ دعوتِ نظارہ دے رہا ہے:

میں کم سواد ہوں کمزور و بے بصارت ہوں
مرا ثباتِ قدم بھی تری بدولت ہے

اس میں کوئی شک نہیں کہ میں بے حد کمزور و نادار انسان ہوں لیکن میں اس قدر جماؤ رکھتا ہوں کہ پوری ثابت قدمی سے دنیا میں رہ رہا ہوں۔ یقیناً یہ سب تیری عطا ہے۔

مثنوی کے انداز میں کہی گئی ایک حمد کے تین منتخب اشعار اہلِ شوق کی نذر ہیں:

ایک معذوری بھی کر دی ہے عطا
تا کہ ہو کفارہءِ جرم و خطا
غافل و مغرور ہو جاؤں نہ میں
درد و غم سے دور ہو جاؤں نہ میں
میرے آقا صابر و شاکر ہوں میں
بندہءِ حق تادمِ آخر ہوں میں

اللہ تعالیٰ کا ہر فیصلہ مبنی بر حکمت ہوتا ہے۔ جیسے اگر وہ کسی کو معذوری سے دوچار کر دے تو اس کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ بندے کے گناہوں کا کفارہ ہو سکے۔ اس کا ایک مقصد یہ ہوتا ہے کہ بندے میں غرور و غفلت کے عوارض پیدا نہ ہوں اور نہ ایک دم درد و غم سے دور ہو کر تعزج آشنا نہ ہو جائے۔ تیسرے شعر میں ابو البیان اس امر کا اظہار کر رہے ہیں کہ اے مولائے کل میں ہر حال میں صابر و شاکر ہوں اور یہ طے ہے کہ تادمِ آخر بندگیءِ حق سے باز نہیں آنا۔

ایک اور شعر دیکھیے:

یوں عبادت میں شب و روز بسر ہو جائیں
اشک آنکھوں میں رہیں اور دعا ہونٹوں پر

عبادت خوب صورت اندازِ بندگی کا دلنشیں سلیقہ اس شعر میں تعلیم کیا گیا ہے یعنی لب پہ دعا ہے اور آنکھوں میں آنسو نیز رب کے حضورت مناجات ہو رہی ہو۔

اگلی نظم میں سے دو حمدیہ شعر ہدیہءِ قارئین کیے جاتے ہیں:

ایک ہے تو ترا نہیں ثانی
سب پہ روشن ہے تری یکتائی

عرشِ اعظم پہ مستوی ہے تو
تیرا مسکن ہے دل کی گہرائی

شعرِ اول میں ربِ یکتا کے لاشریک و لاثانی ہونے کا تذکرہ ہے اور شعرِ ثانی میں صنعتِ تضاد استعمال کرتے ہوئے مالکِ عرش نشیں کو دل کی گہرائیوں سے آشنا قرار دیا گیا ہے۔ چھوٹی بحر کی یہ نظم ہے۔ بحر کا نام بحرِ خفیف مسدس مخذوف ہے جس کا وزن فاعلاتین مفاعلن فعلن ہے۔ یہ نظم خود میں بہت بڑے امکانات رکھتی ہے۔

اس سے آگے ایک غیر مردف حمد نگاہوں کی تواضح کے لیے موجود ہے۔ دو شعر اس میں سے بھی آپ کے ذوقِ جمیل کی نذر ہیں:

تو صمد اور تیرے سب محتاج
انبیا ہوں کہ اولیا ہوں کہ پیر
ہیں جہاں میں نشانیاں تیری
ماہ و انجم یہ آفتاب و منیر

پہلے شعر میں حضرتِ فاتح بارگاہِ خدا میں عرض پرداز ہیں کہ تو بے نیاز و بے پرواہ ہے۔ حقیقت میں ہر کوئی تیرا محتاج ہے۔ قطع نظر اس سے کہ وہ نبی ہوں یا ولی، پیر ہوں کہ مرشد ہوں۔ دوسرے شعر میں وہ آیات اللہ کے حوالے سے رقم طراز ہیں کہ دنیا میں ہر طرف تیری نشانیاں پھیلی ہوئی ہیں۔ وہ چاند تارے ہوں یا آفتابِ ضوفشاں سب تیری قدرتِ کاملہ کے غماز ہیں۔

دو اور شعر ایک اور مرصع ثنا کے ذیل میں رقم کیے جاتے ہیں:

پلکوں سے کروں خدمتِ جاروب کشی میں
حسرت ہے کہ ہو جاؤں ترے در کا مجاور
کرتا رہوں تیری ہی شب و روز پرستش
روشن تیرے ایقاں سے رہے قلب کا خاور

ایسا لگتا ہے کہ جناب ابوالبیان ظہور احمد فاتح کی قوتِ متخیلہ جوبن پر ہے۔ عقیدت کا سمندر ٹھاٹھیں مار رہا ہے۔ ادب کا گراف پوری بلندی پر ہے۔ شعرِ اول میں عرض پرداز ہیں کہ دل میں یہ آرزو جوش مار رہی ہے کہ میں تیرے در کا مجاور بن جاؤں اور اپنی پلکوں سے تیرے درِ دولت پر جھاڑو دیتا رہوں۔ شعرِ

ثانی میں التماس گزار ہیں کہ میں رات دن تیری عبادت میں لگا رہوں، ذوق وشوق اور کثرت سے تیری پرستش کروں کہ مشرقِ ایمان منور ہو جائے۔

پائینِ کتاب چند حمدیہ ابیات ایسے دیے گئے ہیں جن میں ہر بیت چار مصرعوں پر مشتمل ہے اور چاروں مصرعے ہم قافیہ وہم ردیف ہیں۔ ایسا لگتا ہے کہ ان ابیات کو اس وزن پر رقم کیا گیا ہے جس پر مشہور پنجابی صوفی شاعر حضرت سلطان باہوؒ لکھتے رہے ہیں۔ مثلاً

دل دریا سمندروں ڈونگھے کون دلاں دیاں جانے ہُو

ابوالبیان ظہور احمد فاتح نے ''ہُو'' کی بجائے ''تُو'' استعمال کیا ہے جو زیادہ بامعنی اور زیادہ مربوط ہے۔ ویسے تو یہ سب ابیات آبِ زر سے لکھنے کے قابل ہیں تاہم آپ کی ضیافتِ طبع کے لیے ایک بیت جسے بعض لوگ دو بیتا اور بعض چار بیتا بھی کہتے ہیں، پیشِ خدمت ہے:

سب مجبور تری قدرت کے خود مختار تو جابر تو
تو رحمٰن رحیم بے شک ہے مخلوق پہ قاہر تو
سب پہ دھیان ہے تیرا ہر دم سامع تو ہے ناظر تو
نظروں سے گویا غائب تو ہے لیکن دل میں حاضر تو

اللہ رب العزت کے اوصافِ حمیدہ اور اسمائے حسنیٰ کا دلکش امتزاج نیز قدرت کاملہ کا مذکور ایک قوس قزح کی فضا پیدا کر رہا ہے جس سے طبیعت میں سرور اور روح میں نور پیدا ہو جاتا ہے۔

قارئین کرام! ایک ایسی ذات جو سراپا ستودہ صفات ہے، اس کی حمد وثنا کا موثر بیان ایک بہت بڑے ہنر کا کام ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اگر ہم اردو ادب میں منصۂ شہود پر آنے والے مجموعہ ہائے کلام کا جائزہ لیں تو ان میں خالص حمد کے موضوع پر لکھی جانے والی کتب کی تعداد نسبتاً کافی کم ملے گی۔ سبب یہی ہے کہ اس بڑی ہستی کے حوالے سے قلم اٹھانا کارے دارد ایسے طبائع جن کی سرشت غلو کی بجائے توحید پرستی ہو، شاذ ہی نظر آئیں گی اور اگر آ بھی جائیں تو ان مبارک ہستیوں میں ایسے نادر البیان لوگ خال خال ہی ملیں گے جو مالکِ حقیقی سے باندازِ سخن ہم کلام ہونے کا یارا رکھتے ہیں۔ جہاں تک حمدیہ مجموعۂ کلام ''روح ترے مراقبے میں ہے'' کا تعلق ہے، یہ یقیناً ایک عظیم شعری کارنامہ ہے جو ہر پہلو سے دل نواز و دل نشیں ہے۔ اس کے فنی امکانات اسے سدرہ آشنا کر رہے ہیں تو فکری امکانات بے حد رفیع و وقیع ہیں۔ بالغ نظری کا یہ عالم ہے کہ طبیعت باغ و بہار ہو جاتی ہے۔ صنائع بدائع کا یہ عالم ہے کہ روحِ انساں

عش عش کر اٹھتی ہے۔ مضمون آفرینی اور مدحت نگاری اس قدر پختہ اور منجھی ہوئی ہے کہ اہلِ سخن سر دھنتے رہ جاتے ہیں۔ کہیں بھی کوئی خلافِ واقعہ یا معیار سے گری ہوئی بات محسوس نہیں ہوتی۔ جہاں تک ہیئتی حوالوں کا تعلق ہے، ایک قادر الکلام سخن ور کی حیثیت سے ابوالبیان ظہور احمد فاتح نے بہت سی اصناف میں تجربے کیے ہیں۔ ہر چند کہ ان کا محبوب انداز غزلیاتی اسلوب ہے اور یہاں حمد میں بھی انہوں نے غزل کے مزے لیے ہیں۔ محبوبِ حقیقی سے ایسی گہری محبت بھری باتیں کی ہیں کہ شاید مجازی محبوب سے بھی نہ کی جا سکیں۔ علاوہ ازیں مثنوی، ثلاثی، قطعہ بند، مخمس و مسدس، نظمِ معریٰ اور آزاد نظم کے تجربات بھی اپنی بہار دکھاتے نظر آتے ہیں۔ آزاد نظم میں انہوں نے بہت سی حمدیں رقم کی ہیں جو پابند سخن سے کسی طرح کم نہیں ہیں۔ عمومی قوافی کے ساتھ ساتھ انہوں نے خصوصی اور دشوار قوافی بھی استعمال کیے ہیں۔ علاوہ ازیں بین السطور داخلی قوافی کا استخدام بھی ان کی فنی چابک دستی کی دلیل ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ایسے شاعر بعد از انتظارِ بسیار اہلِ جہاں کو میسر آتے ہیں۔

قلبی وابستگی بھی ایک اہم عنصر ہوا کرتی ہے۔ جناب ظہور احمد فاتح اپنے اللہ سے بہت زیادہ محبت کرنے والے اور خود کو اس کی بندگی میں رنگنے والے انسان ہیں۔ ایسا لگتا ہے کہ حمد نگاری ان کا پسندیدہ میدان ہے جس میں ان کے شعری جواہر خوب کھلتے ہیں۔ زبان و بیان پر ان کی بھرپور دسترس اپنا رنگ دکھا رہی ہے۔ خصوصاً عربی فارسی الفاظ و تراکیب کا برمحل استعمال اور مصرعوں کی چست حسنِ بیان کا ایک خاص قرینہ ہے۔ علیٰ ہذا القیاس ثنا گوئی میں ابوالبیان ظہور احمد فاتح اپنا کوئی ثانی نہیں رکھتے۔ ایسی مرصع نظم جو کہیں کہیں بے حد سلیس و سادہ بھی ہو جاتی ہے، اپنے والہانہ پن کے زیرِ سایہ دلوں کو چھو جاتی ہے۔ کلام میں ایسے ایسے نادر نمونے اور دل آویز مقامات پائے جاتے ہیں کہ قارئین ان میں جذب ہو کر رہ جاتے ہیں۔

ایں سعادت بزورِ بازو نیست
تا نہ بخشد خدائے بخشندہ

ابوالبیان ظہور احمد فاتح کی نعت نگاری

مالکِ حقیقی نے بنی نوع انسان کو اشرف المخلوقات بنایا اور پھر اس پر مزید کرم یہ کیا کہ اسے وارثِ لوح وقلم بنا دیا۔ اس عظیم عزت افزائی کا ثبوت سورۃ القلم کی ابتدائی آیت سے ملتا ہے۔ **و القلم و ما یسطرون**۔ یعنی ''قسم ہے قلم کی جو وہ لکھتے ہیں۔'' اس نازش میں اور اضافہ ہو جاتا ہے جب لکھنے والا اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی تعریف میں خامہ فرسائی کرتے ہیں کیونکہ ایسا کرنا انہیں مقصدِ حیات سے قریب تر کر دیتا ہے۔ اپنے محسنین کے ذکرِ جمیل میں رطب اللسان ہونا حقیقی قدر شناسی کی علامت ہے۔ اللہ کے آخری پیغمبر حضرت محمد مصطفیٰ احمد مجتبیٰ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم جو حقیقی محسنِ انسانیت ہیں، ان کی مدحت سرائی ایک اعلیٰ ادبی قرینہ اور ارفع شعری شعار ہے جسے عرفِ عام میں نعت گوئی کہا جاتا ہے۔

مسلم شعرا میں سے اکثر و بیشتر اہلِ سخن کو مالکِ دو جہاں نے یہ توفیق بخشی ہے کہ انہوں نے نبی ختمی مرتبت صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی توصیف شد و مد سے کی ہے۔ اس پر بس نہیں، اس ذاتِ ستودہ صفات کے حوالے سے غیر مسلم شعرا نے بھی دادِ سخن دی ہے۔ شذرہ ہذا میں ہم عصرِ حاضر کے جلیل القدر استاد شاعر پروفیسر ظہور احمد فاتح کی نعت گوئی کی نسبت سے رقم طراز ہیں۔ ابوالبیان ظہور احمد فاتح جو ایک قابل معلم ہونے کے ساتھ ساتھ ایک عالمِ دین، حبِ خدا اور رسول صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم سے معمور دل رکھنے والے انسان ہیں، ان کے کلام میں بے شمار نعتیں پائی جاتی ہیں جن میں سے کچھ ان کے پہلے مجموعۂ نعت ''سلام کہتے ہیں'' مطبوعہ دسمبر 2006ء میں شامل ہیں۔ اس وقت ان کا یہ نعتیہ کلام ہمارے روبرو ہے جو ایک سو چھتیس صفحات پر مشتمل

نہایت خوب صورت کتابی شکل میں ہمارے ہاتھ میں ہے۔ نرم و گداز جلد، چکنا اور ریشمی کاغذ، نہایت خوب صورت ٹائٹل، ان خوبیوں نے حسنِ کتاب میں چار چاند لگا دیے ہیں۔ یہ تو ہے ظاہری ہیئت کی بات، اب باطنِ کتاب میں محوِ نظارہ ہوتے ہیں۔

سبحان اللہ ماشاء اللہ بین السطور حبِ رسول ﷺ کے ایسے مظاہر جلوہ گر ہیں کہ طبیعت باغ و بہار ہو جاتی ہے۔ ایک ایسا شخص جو اپنے وہابی ہونے پر ناز کرتا ہے، رسولِ مقبول ﷺ سے اس کی اس قدر شیفتگی اور محبت سے مزین ہے کہ خدا کی قدرت یاد آ جاتی ہے۔ کتاب ہٰذا کا انتساب ام المومنین حضرت خدیجۃ الکبریٰ رضی اللہ عنہا کے نام ہے جن کی بے لوث محبت و غم گساری رسولِ مخزون ﷺ کے لیے سرمایۂ جاں نواز ثابت ہوئی۔ کتاب کا حرفِ آغاز خود رقم فرمایا ہے۔ لکھتے ہیں کہ:

> ''رسول پاک ﷺ کی ذاتِ بابرکات بہت رفیع الشان ہے جسے خود خالقِ دو جہاں نے سراہا ہے اور صورت و سیرت کے حسن و کمال کی اسناد عطا فرمائی ہیں۔ لہٰذا ایسی جلیل القدر ہستی کے بارے میں قلم اٹھاتے ہوئے احتیاط انتہائی ضروری ہے کہ ذرا سی بھول چوک اعمال کے ضیاع کا باعث بن سکتی ہے۔ اس لیے محبت کے ساتھ ساتھ ادب و احترام کو ملحوظ رکھنا انتہائی ضروری ہے۔''

مزید تحریر کرتے ہیں:

> ''الفتِ رسول ﷺ کے لیے عموماً عشقِ رسول اللہ ﷺ کا لفظ استعمال ہوتا ہے جو میرے خیال میں نبی کریم ﷺ کے شایانِ شان نہیں ہے کیونکہ عشق میں جنون کا عنصر شامل ہوتا ہے اور یہ با خدا دیوانہ باش و با محمد ﷺ ہوشیار کے قاعدے کے خلاف ہے۔ ویسے بھی ایسی تقدیس مآب ہستیوں کے لیے عشق کا لفظ استعمال کرنا نامناسب ہے۔ کبھی نہ سنا ہوگا کہ کوئی دعویٰ کرے کہ مجھے والدہ سے عشق ہے یا بہن سے عشق کرتا ہوں لہٰذا اس مقصد کے لیے ''حب'' کا لفظ زیادہ مناسب رہے گا۔''

نعت گوئی کے اصول و مبادی پر روشنی ڈالتے ہوئے یہ ہدایت قلم بند کرتے ہیں:

''یہ بات شعرا کی عادت میں شامل ہے کہ دمِ تعریف غلو سے کام لینے

لگتے ہیں یعنی حفظِ مرات کا خیال رکھے بغیر حدود و قیود سے گزر جاتے ہیں حالانکہ جو ذات پہلے ہی ''رفعِ ذکر'' کے منصب پر فائز ہو، غالیانہ شاعری کر کے اس کے رتبے میں کیا اضافہ کیا جا سکتا ہے۔ چنانچہ نعت گوئی کے میدان میں قدم رکھنے والوں کے لیے غلو سے بچنا ناگزیر ہے۔''

بین السطور بجا طور پر لکھتے ہیں :

''نبی محترم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی سیرت وصورت کے بارے میں جو صراحتیں موجود ہیں، انہیں مشعلِ راہ بناتے ہوئے نعتیہ اشعار لکھنے چاہئیں کیونکہ سچائی اور حقیقت نگاری فی نفسہٖ خوب صورتی کی حامل ہوتی ہے۔اور خلافِ واقعی دور از کار باتیں نعت میں لانے سے گریز کرنا چاہیے۔ نبی مہربان ﷺ ہمارے لیے اسوہ ءحسنہ رکھتے ہیں لہٰذا الفت میں آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی سیرتِ طیبہ کے زیادہ سے زیادہ دل نواز پہلوؤں کو اجاگر کیا جائے تا کہ قارئین وسامعین کے دل میں اتباعِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کا شوق اور جذبہ پیدا ہو۔اس طرح ہماری نعت مدحتِ پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے ساتھ ساتھ پیام وموعظت کا کام بھی دے۔

وہ حرفِ آغاز میں ہی بڑے پتے کی بات لکھتے ہیں:

''ایک سچے نعت خوان کو قال کے ساتھ ساتھ حال کے اوصاف سے بھی بہرہ افروز ہونا چاہیے کیونکہ نبی حتمی مرتبت کا ارشاد ہے کہ جو میری سنت سے محبت کرتا ہے وہی حقیقت میں مجھ سے محبت کرتا ہے۔ اگر ہم اتباعِ رسول صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے سانچے میں ڈھلے ہوئے ہوں گے تو ہمارے الفاظ میں ہمارے اعمال کا نور بھی شامل ہو جائے گا جو ہماری لکھی ہوئی نعت کو اثر آفرینی کے جواہر سے مالا مال کر دے گا۔''

پائینِ تحریر یوں درج کرتے ہیں:

''ہمیں پاک پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کو فوق البشر شخصیت کا پیرہن پہنانے کی بجائے اللہ کے عبدِ خاص، اس کے محبوب بندے، اس کے ذیشان پیغمبر، اس کے دینِ اسلام کے سچے خادم اور اس کے بندوں پر بے انت مشفق انسان کو

پیرائیہ میں ڈھال کر بیان کرنا چاہیے۔ اس طرح ہم صحیح معنوں میں اور صحیح خطوط پر نعت گوئی کے منصب سے عہدہ برآ ہو سکتے ہیں۔"

جو کہیے شایانِ شان کہیے
کسی کی تعریف یوں روا ہے
مگر یہ نکتہ بھی یاد رکھیے
ہے بندہ بندہ، خدا خدا ہے

اب نعتوں کا سلسلہ شروع ہوتا ہے۔ گویا ایک عالمِ انوار ہے کہ تجلی در تجلی پھیلتا چلا جاتا ہے۔ کتاب کی سب سے پہلی نعت دراصل وہ نعت ہے جو شاعرِ موصوف نے اولین تجربے کے طور پر غالباً ساتویں یا آٹھویں جماعت میں کہی تھی جس کا ایک شعر آپ کے ذوقِ جمیل کی نذر ہے:

نورِ حق سے تو نے گمراہوں کو رہبر کر دیا
میرے ہادی تجھ سا رہبر کوئی ہو سکتا نہیں

ذرا غور فرمایئے کہ لڑکپن میں کیسی پختہ نعت گوئی کی کیفیت پائی جاتی ہے۔ مصرع اول میں صنعتِ تضاد کا استعمال اور مصرع ثانی میں مترادفات کی بندش عین فطری محسوس ہو رہی ہے اور یہ ایک بھرپور خراجِ عقیدت کا درجہ بھی رکھتی ہے۔

رسول مقبول ﷺ جو فخرِ موجودات ہیں، ان کی بارگاہ میں یہ شعر کس قدر پرنازش ہے:

ہے تری معراج پر نازاں فرازِ آسماں
تیری ہستی سے زمینِ پست کی تزئین ہے

پیارے نبی ﷺ بے حد و حساب خوبیوں کے مالک ہیں۔ ان کے دو کمالات کا ذکر جو ایک شخصیت میں شاذ ہی اکٹھے ہوتے ہیں، نعت کے اس شعر میں کس خوبی سے بیان کیے گئے ہیں:

وہ حسن کہ آنحضرت محبوبِ خدا ٹھہرے
وہ رعب کہ لرزیدہ کہسار نظر آئے

اسی نعت کا آخری شعر خود میں ایک جہانِ آرزو لیے ہوئے ہے جو دعائیہ رنگ میں پائینِ نعت وارد ہوا ہے جیسے کوئی بھی ایک نیک کام کرنے کے بعد مالک الملک کے حضور دعا مانگی جاتی ہے چنانچہ ملتجی ہیں:

یارب کبھی فاتح کو دیدارِ محمدؐ ہو

پھر جامِ شہادت سے سرشار نظر آئے

ایک بندہءِ مومن کے لیے دیدارِ پیغمبر اور جامِ شہادت سے بڑھ کر اور کیا چیز قیمتی ہو سکتی ہے؟ نبی ختمی مرتبت صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم سے راقم کی الفت کا رنگ ملاحظہ کریں:

مرے روز و شب ہوں مدینے میں مالک

کہ رکھتا ہوں میں اس نگر کی تمنا

سرکارِ مدینہ، سرورِ قلب و سینہ سے گہری محبت کے حامل ایک نعت کے دو شعر نذرِ قارئین و سامعین ہیں:

کسی شب خواب کی دنیا میں آئیں یا رسول اللہؐ

ہمیں اپنا رخِ زیبا دکھائیں یا رسول اللہؐ

یہ تیرا شوق ہی تو حاصلِ ایمان ہے اپنا

نہیں ممکن تجھے ہم بھول جائیں یا رسول اللہؐ

کیا حسنِ تخاطب ہے کیا جمالِ آرزو ہے کیا اظہارِ خلوص ہے، نعت ہی نعت میں بیانِ سیرت جنابِ فاتح کا حصہ ہے۔ اس حوالے سے ان کا یہ شعر دیدنی ہے:

سوچیں اگر تو آپؐ ہیں محبوبِ کبریا

دیکھیں اگر تو سیرتِ قرآن آپؐ ہیں

پیغمبر آخر الزماں صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی علوئے شان کا بیان ان دو شعروں میں کتنی خوبصورتی سے کیا گیا ہے:

رشکِ فلک زمین ہے آمد سے آپؐ کی

انسانیت کو ناز ہے انسان آپؐ ہیں

سدرہ پہ گفتگو ہوئی راز و نیاز کی

پروردگار کے حسیں مہمان آپؐ ہیں

بہت سے لوگوں میں یہ غلط فہمی پائی جاتی ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کا سفرِ معراج عرشِ عظیم تک تھا حالانکہ قرآن و حدیث میں اس کا کوئی ثبوت نہیں ملتا۔ سورۃ النجم کی آیات اور معراج سے متعلقہ دیگر احادیث اس امر کی باضابطہ صراحت پیش کرتی ہیں کہ حضرت محمد مصطفیٰؐ حبیبِ کبریا صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کا سفرِ معراج سدرۃ المنتہیٰ تک تھا۔ یہ ایک ایسا علمی نکتہ ہے جسے نعت کے پیرائے میں صاف کر دینا ابوالبیان ظہور احمد فاتح کی جرات

وصلاحیتِ عالمانہ کا خاصا ہو سکتا ہے۔

وہ ذاتِ بابرکات جو دل و جان کے لیے باعثِ تسکین و آرام ہے، یقیناً اس نیاز مندی کا استحقاق رکھتی ہے کہ ان کی خدمتِ عالی میں نذرانہ ہائے درود و سلام پیش کیے جائیں۔اسی نسبت سے استادِ ادب کا یہ شعر محلِ نظر ہے:

بھیجیے ان کی مقدس ذات پر لاکھوں سلام
بن کے تسکینِ دل و آرامِ جاں پیدا ہوئے

یہ شعر دراصل میلادِ مولود کا ایک بھرپور حوالہ ہے جس کی ایک سخت وہابی عالم سے توقع نہیں کی جا سکتی۔

ایک زمانہ گزر گیا ہے نور و بشر کی بحث ختم ہونے کو نہیں آرہی۔ پروفیسر ظہور احمد فاتح نے ایک ہی شعر میں اس طویل قضیئے کو نمٹا کر رکھ دیا ہے۔شعر پڑھیے اور دادِ ہنر دیجیے:

سیرت میں شرحِ قرآن صورت میں
رشکِ یوسف نور الہدیٰ محمدؐ خیر البشر محمدؐ

آیئے اب ایک اور نوعیت کا نعتیہ شعر دیکھتے ہیں۔اس میں شاعرِ عصر نے اپنی کمزوری اور درماندگی کا ذکر کرتے ہوئے رب العزت کے حضور درخواست گزاری ہے:

اے خدا میں ناتواں بھی ہوں قتیلِ شوق بھی
غیب سے سامان کر طیبہ دکھانے کے لیے

ایک کشتۂ محبت کے لیے زیارتِ مدینہ کا سامانِ قدرت سے ہو جانا کمالِ خوش نصیبی اور باعثِ فخر امر ہے۔

تاریخی حوالے سے بعثتِ محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے لیے جو انبیا دعا گو ہوئے، از راہِ صنعتِ تلمیح ان کا تذکرہ حسبِ ذیل شعر میں کس لطافت سے کیا گیا ہے:

ہے تو ہی وجہِ سجود آدم نویدِ جاں بخش ابنِ مریم
دعائے مقبول ابنِ آذر درود تجھ پر سلام تجھ پر

طویل بحر کی اس نعت کا ایک اور شعر درگاہِ نبوی میں ایک زبردست خراجِ تحسین کا درجہ رکھتا ہے:

تو باغ توحید کا ہے مالی تو کشورِ دو جہاں کا والی

تو ساقیءِ سلسبیل و کوثر درود تجھ پر سلام تجھ پر

ساقیءِ سلسبیل وکوثر کے حضور کے اس حوالے سے درود وسلام بھیجنا کہ وہ گلشنِ توحید کا مالی بھی ہے اور کشورِ دو جہاں کا والی بھی ہے، اور زیادہ معنی خیز ہو جاتا ہے۔

آمدِ مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی نسبت سے نظم کا ایک شاندار بند التفاتِ دل کو اپنی طرف مبذول کرا رہا ہے:

یہ کس مسیحا نفس کا ورود ہے یارو؟

کہ رنگ و نور کی ہر سمت حکمرانی ہے

زمیں زمیں نہیں جیسے بہشت ثانی ہے

منفرد ہیئت کی یہ نعت تشبیہات و استعارات کا ایک دلکش مرقع ہے۔

سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے حضور ایک چھوٹی مگر کثیر رکنی بحر والی نعت جس میں داخلی قوافی کا اہتمام بھی کیا گیا ہے اور جس کی ردیف درود شریف پر مشتمل ہے، ابوالبیان ظہور احمد فاتح کی فنی چابکدستی پر شاہدِ عادل ہے۔ ذرا یہ شعر دیکھیے۔

آپؐ کے چرچے محفل محفل آپ کے شوق میں دل ہیں بسمل

آپؐ کے ہجر میں آنکھ ہے پرنم صلی اللہ علیہ والہٖ وسلم

اس خوبصورت شعر کے بعد ایک اور نعت کے چار اشعار دامنِ توجہ کھینچ رہے ہیں۔ ان میں سے پہلا شعر جو زیرِ نظر ہے، وہ اتحاد بین المسلمین کا مظہر ہے۔ سنی، شیعہ کے فرقوں میں بٹے ہوئے ابنائے امت کے لیے صلائے عام ہے:

آپؐ کے اصحاب سے بے حد عقیدت ہے مجھے

میرے دل میں موجزن ہے حبِ آلِ مصطفیٰؐ

اس سے آگے والا شعر سیرتِ طیبہ کا دلکش عندیہ ہے:

نقش ہے انسانِ کامل کی حیاتِ پاک کا

ہر شب و روزِ نبی ہر ماہ و سالِ مصطفیٰؐ

یعنی حیاتِ طیبہ کا ایک لمحہ جو حدودِ روز وشب سے نکل کر سالہا سال پر محیط ہو جاتا ہے، ایک دلکش نقش ہے جو ناقابلِ فراموش ہے۔

صنعتِ تضاد کا خوبصورت مظہر یہ نعتیہ شعر ملاحظہ ہو:

اللہ اللہ بزمِ یاراں میں وہ رحمت کا سماں
الحذر وہ رزم گاہوں میں جلالِ مصطفیٰ ؐ

شاندار بندشِ الفاظ اور بھرپور شوکتِ بیاں کا حامل یہ شعر تاریخِ نعت کا ایک زریں حوالہ ہے۔
شاعر خدا کے خوبصورت قاصد کی مدح کرتے کرتے اس کی غلامی کا دم بھرتے ہوئے اپنی تعریف کرنے لگتا ہے اور اس خود ثنائی کو اس عظیم تعلق پر محمول کرتا ہے جو نبی اور امت کے مابین قائم و دائم ہے:

کیوں نہ فاتح خوبیء تحریر پر نازاں رہوں؟
میں کہ ٹھہرا ہوں غلامِ خوش خصالِ مصطفیٰؐ

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پیارے پیارے القابات میں سے ایک لقب ''کملی والا'' بھی ہے۔ کیونکہ آپ اکثر سیاہ چادر جو خاصی دبیز تھی، کاندے پر رکھتے تھے اور اسی حوالے سے سورۃ مزمل اور مدثر کا نزول ہوا ہے۔ ابو البیان ظہور احمد فاتح نے رسولِ مکہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو کمالِ محبت سے کملی والے کہہ کر مودبانہ مخاطب کیا ہے کہ فاتح پر بہت بڑی عنایت ہوگئی ہے کہ اس کی بے نوری کے باوصف اسے نورِ علم اور نورِ بصیرت سے آراستہ و پیراستہ کر دیا گیا ہے۔ ایک محبِ رسول کا بارگاہِ نبوی میں حاضر ہونا یقیناً کمال خوش نصیبی ہے کیونکہ دربارِ رسالت میں حاضری کی تمنا ایک عرصے سے وہ دل میں لیے پھرتا ہے اور جب یہ آرزو پوری ہوجاتی ہے تو نہایت ہی مسرور و مطمئن ہو جاتا ہے اور اسے معراجِ قسمت گردانتا ہے۔ شعر ملاحظہ ہو:

یہی معراجِ قسمت ہے یقیناً
درِ خیر البشر ہے اور میں ہوں

اسی طرح محب آستانِ محبوب میں حاضری کو باعثِ چارہ گری سمجھتا ہے اور امید رکھتا ہے کہ اب شربتِ وصال پی کر اس کے سارے دکھ دور ہو جائیں گے۔ ان کا یہ شعر اس امر کی طرف اشارہ کرتا ہے:

مرے دکھ دور ہو جائیں گے فاتح
مقامِ چارہ گر ہے اور میں ہوں

غالب نے کہا تھا:

سب رقیبوں سے ہیں ناخوش پر زنانِ مصر سے
ہے زلیخا خوش کہ محوِ ماہِ کنعاں ہو گئیں

بالکل اسی نوعیت اور اسی مضمون کا حامل ہمارے شاعرِ موصوف کا یہ شعر ہے جو ان کی پاکیزہ محبت کا

ترجمان ہے۔ وہ محبت جو محبوبِ خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور اس کے چاہنے والوں سے اس کے دل میں موجزن ہے:

فاتح انوکھا پیار ہے ذاتِ شریف سے
میں محو ہو کے رہ گیا اپنے رقیب سے

اوصافِ حمیدہ کے مفصل بیان کے حامل ایک نعت کے تین شعر درِ ادراک پر دق الباب کر رہے ہیں۔ چنانچہ ہدیۂ قارئین کیے دیتے ہیں:

تری صورت تیری سیرت ترے کردار کے صدقے
تری رحمت، تری شفقت، ترے ایثار کے صدقے
یہ سب حسنِ جہاں یہ سب جمالِ انجمن آرا
تری چشم وجبیں تیرے لب و رخسار کے صدقے
مٹی دنیا سے تاریکی توہم کی جہالت سے
ضیا افکار نے پائی ترے افکار کے صدقے

عمیق حبِ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے مظہر ایک اور نعت کے تین شعر ملاحظہ ہوں:

آرام سے بھی بڑھ کر اس درد کی لذت ہے
سورج سے کہیں روشن یہ داغ ہے سینے کا
محبوبِ دو عالم کی ہر بات نرالی ہے
خوشبوؤں کا سمندر ہے ہر قطرہ پسینے کا
معراجِ محبت ہم کہتے ہیں اسے فاتح
جب ہوش رہے تجھ بن کھانے کا نہ پینے کا

کمالاتِ پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور حبِ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے حوالے سے دو اور عظیم نعتیہ اشعار مرغوبِ نظر ہیں۔ پڑھیے اور محظوظ ہوئیے:

وہ سرخیلِ بطحا، وہ محبوبِ طیبہ، وہ سالارِ اعظم ، وہ سلطانِ عالم
وہ تشریف لائے ہیں جب سے جہاں میں زمانہ نئی رحمتیں پا رہا ہے
محمدؐ کا انداز ہے سب سے پیارا جو اپنے اس کو وہی نرم آرا
جسے خوش نہیں ہے ادائے پیمبر وہ خود اپنے اوپر ستم ڈھا رہا ہے

حضور ابو القاسم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے حضور ابو البیان ظہور احمد فاتح کی ایک اور فرطِ عقیدت سے معمور نعت کے تین اشعار دامنِ دل کھینچ رہے ہیں۔ سنیے اور سر دھنیے:

مخدوم آ کے بن گئے خادم ترے حضور
محکوم آ کے ہو گئے حاکم ترے حضور
بخشی تجھے علیم نے وہ وسعتِ علوم
تلمیذ کی طرح رہے عالم ترے حضور
خونِ جگر کی لو میں لکھ لایا ہوں ایک نعت
کرنے کو پیش اے ابو القاسمؐ ترے حضور

پہلے دو اشعار میں صنعتِ تضاد اپنی بہار دکھاتی نظر آ رہی ہے۔

تعلیمات نبوی کا اظہار پیرائیۂ نعت میں جس خوب صورتی سے حضرتِ فاتح کرتے ہیں، وہ بس انہی کا خاصا ہے۔ ملاحظہ ہوں ذیل کے اشعار جن میں بڑی مہارت سے حکمتِ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اجاگر کیا گیا ہے:

سبحان اللہ کیا کرم کیا ذیشان مدینے والے نے
بندوں سے کرائی اللہ کی پہچان مدینے والے نے
ہے ظلم عظیم یہی لوگو ہر حال میں شرکی سے بچنا تم
یہ بات ہمیں سمجھائی ہے ہر آن مدینے والے نے
یہ صدق وصفا کا معدن ہے یہ مہر و وفا کا مخزن ہے
مصحف جو عطا فرمایا ہے فرقان مدینے والے نے

منصبِ نبوت کے کارہائے نمایاں سے ابنائے آدم میں جو کرشمہ سازیاں ہوئیں، ان کی عکاسی جنابِ فاتح کے ان دو اشعار میں پائی جاتی ہے:

آپ لائے وہ پیغامِ ظلمت ربا شامِ اوہام دنیا سے رخصت ہوئی
جو ہے توحید کا مقتضائے حسیں خلق و خالق میں وہ دوستی ہو گئی
رشکِ مہتاب ہے صورتِ مصطفیٰؐ شرح و قرآن ہے سیرتِ مصطفیٰؐ
ہم پہ اسرارِ تکریمِ آدم کھلے مقصدِ خلق سے آگہی ہو گئی

رسول اکرم ﷺ کی ذاتِ بابرکات اور حیاتِ ستودہ صفات سراپا روشنی ہے۔ انوارِ رسالت کے حوالے سے ابوالبیان ظہور احمد فاتح اس عقیدت سے رقم طراز ہیں:

کیا عرض کریں اس رخِ زیبا کی صباحت
وہ عارضِ لب نور ہیں وہ چشمِ جبیں نور
دونوں رہے اسلام کی بنیاد پہ فاتح
ارشادِ نبی نور ہے قرآنِ نبی نور

اہلِ ایمان جہاں نبی ختمی مرتبت ﷺ سے قلبی الفت کا اظہار کرتے ہیں، وہاں ان کے بابرکت شہر مدینہ منورہ کے بھی دل و جان سے قدردان ہیں۔ شوقِ مدینہ ان کے رگ و ریشہ میں سرایت کیے ہوئے ہے۔ حضرتِ فاتح نے مدینہ کے حوالے سے جس شیفتگی اور والہانہ پن کا اظہار کیا ہے، وہ ناقابلِ فراموش ہے۔ ذیل کے اشعار ملاحظہ کیجئے:

کرے نصیب زیارت خدا مدینے کی
ہے دردِ دل کا مداوا فضا مدینے کی
ہے یادگار مواخات کا حسیں منظر
کہ گل زمیں ہے سراپا وفا مدینے کی
یہ مہر و ماہ کواکب کے بس کا روگ نہیں
اُجالتی ہے دلوں کو ضیا مدینے کی
بنا کے سرمہ لگاؤں بصد خوشی فاتح
کرو جو خاک ذرا سی عطا مدینے کی

حضرت محمد ﷺ کے لائے ہوئے دینِ متین کی بنیادوں کی احاطہ بندی کرتے ہوئے شاعرِ موصوف بڑی خوبصورتی سے خراجِ تحسین پیش کرتے ہیں۔

شانِ دین و وحدت کی ضو کتاب و سنت کی
عالمِ عقیدت کی رونقیں اسی سے ہیں

خالص نعتیہ انداز کا ایک بند جو ہیئت کے اعتبار سے منفرد اور کیفیت کے اعتبار سے جامع ہے، ہدیۂ قارئین کیے دیتے ہیں۔ ذرا اس کی بحر پر بھی غور فرمایئے گا۔ اس مختصر بحر میں جس فنی چابکدستی کا مظاہرہ کیا

گیا ہے، اسے کسی طور پر نظر انداز نہیں کیا جا سکتا:

وصفِ جود و سخا
متقی پارسا
کانِ شرم و حیا
شہسوارِ وفا
مصطفیٰؐ مصطفیٰؐ
مصطفیٰؐ مصطفیٰؐ

جوش ملیح آبادی نے ایک بہت عمدہ شعر نعت کے حوالے سے کہا تھا:

تو نے ثابت کر دیا اے آخری پیغامبر
مرد یوں مہریں لگاتے ہیں جبینِ وقت پر

ایسے ہی خوبصورت تخیلات کی گونج پروفیسر ظہور احمد فاتح کے حسبِ ذیل اشعار میں سنائی دے رہی ہے۔ سنیے اور سر دھنیے:

کر دیا تو نے یہ تحسینِ عمل سے ثابت
اس تجمل سے جیا کرتے ہیں جینے والے
اہلِ ایمان ہے درویشِ خدا ہے فاتح
سب ترا فیض ہے رحمت کے خزینے والے

نعت کا ایک نیا انداز ان دو اشعار میں ملاحظہ ہو کہ جن میں اطاعتِ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا جذبہ بھی کارفرما ہے اور انبیائے ماقبل کی دعاؤں کا حوالہ بھی موجود ہے جو آپؐ کی مندوب و محبوب شخصیت کی خدمتِ عالی میں بھرپور خراجِ عقیدت ہے۔

غیروں کی اتباع سے قاصر رہیں گے ہم
ہم پیروی کریں گے خدا کے ندیم کی
وہ ذات جس کے حق میں دعائے خلیل ہے
جس کے لیے گواہی مسیح و کلیم کی

مذہبی تعلیمات کا اظہار عمومی پیرائیہ نعت میں کم ہی آتا ہے حالانکہ یہ ناگزیر ہے کہ حسن و جمالِ مصطفیٰؐ

کے ساتھ ساتھ درسِ کمالِ مصطفیٰ کی بھی جھلکیاں موجود ہیں۔ مشکوٰۃِ رسالت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے پھوٹنے والی روشنیاں جنہیں ہم پیغمبری آدرش کا نام دے سکتے ہیں، اگر نعت کا معتد بہ حصہ ٹھہریں جن سے محبانِ نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی آموزش بھی ہوتی ہے تو یہ بات نعت نگاروں کے لیے بہت اہم ہے۔ یہی حال ابوالبیان ظہور احمد فاتح کی نعت گوئی کا ہے۔ ان کی ایک ہی نعت کے سات اشعار اسی تناظر میں ملاحظہ ہوں:

بڑا احسان ہے ہم پر یہ دربارِ رسالت کا
سلیقہ اس نے بخشا ایک آقا کی عبادت کا
دیا ہے درس حضرت نے مساوات و اخوت کا
پڑھایا سبق بندوں کو بندوں سے محبت کا
سکھایا اس نے اندازِ عمل قرآن و سنت کا
جہنم ہے ٹھکانہ عاملینِ ظلم و دہشت کا
ہمیں روکا زنا سے قتل سے جوری سے جوئے سے
کہا نشۂ تکبر، جھوٹ ہے باعث ہلاکت کا
جہادِ فی سبیل اللہ کی تاکید فرمائی
شرف جس کی بدولت پایا قوموں کی امامت کا
لکھی ہے نعتِ پیغمبر کہ اس آئینے میں فاتح
دکھائیں عکس دنیا کو نبی کی پاک سیرت کا

رسولِ مخزون صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی فکرِ امت کی کیفیت کسی سے ڈھکی چھپی نہیں ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم غمِ امت میں اکثر افسردہ رہا کرتے تھے۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی اس کیفیت کا بیان بھی حسنِ نعت گوئی کا حصہ ہے جسے پروفیسر ظہور احمد فاتح نے بصد حسن وخوبی نبھایا ہے۔ علاوہ ازیں سفرِ معراج اور سدرہ نشینی کی نسبت سے بھی انہوں نے بہت عمدہ اشعار جزوِ نعت بنائے ہیں۔ ذیل میں ان کی ایک نعت کے دو اشعار نقل کیے جاتے ہیں:

ثابت یہ ہوا ہم سے تھا پیار تجھے کتنا؟
تجھ کو غمِ امت میں ہر وقت حزیں دیکھا
معراج کی دھومیں تھیں افلاک نشینوں میں

بیٹھا جو سرِ سدرہ اک خاک نشیں دیکھا

یادِ نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم وہ متاعِ بے بہا ہے جو قلبِ شاعر کو کنجِ سائیگاں بنا ڈالتی ہے اور اسے ایسی راحت و طمانیت حاصل ہوتی ہے جو بیان سے باہر ہوتی ہے۔ ایک نعت کے مندرجہ ذیل چار اشعار جنابِ فاتح کی بھرپور نعت گوئی کا مظہر ہیں:

بخدا کہ پیار شدید ہے تیرے حسن، تیرے جمال سے
تیرے معجزوں پہ ہے دل فدا تیری ندرتیں ہمیں یاد ہیں
کوئی حد کرشمہ و خیر کی تیری ذات میں نہ صفات میں
بڑی دل نشیں تیری خصلتیں تیری عادتیں ہمیں یاد ہیں
تیرا فیض، فیضِ تمیم ہے، تیرا لطف لطفِ عظیم ہے
تری شفقتیں ہیں عزیزِ دل تیری الفتیں ہمیں یاد ہیں
وہ جو اہتمامِ غنا کیا کہ ادھار لے کے عطا کیا
تیری حاجتیں، ہمیں یاد ہیں، وہ سخاوتیں ہمیں یاد ہیں

ظہور احمد فاتح زبردست توفیقی انداز میں حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی مدحت سرائی کرتے ہیں۔ زبان و بیان کا ترفع اور حسنِ تخاطب قابلِ دید ہے۔ دہرے قوافی اپنی ایک شان دکھاتے ہیں۔ ایسا لگتا ہے کہ سمن زارِ نعت اپنی پوری بہار پر ہے۔ لیجئے ایک نعت کے تین اشعار از راہِ استشہاد پیشِ خدمت ہیں:

وہ بطحا، وہ مکہ، وہ طیبہ مدینہ وہ نایاب گوہر وہ نادر نگینہ
ترے دونوں شہروں پہ قربان عالم رسولِ مکرمؐ نبیٔ معظمؐ
وہ صدیق و فاروق و عثمان و حیدر صحابہ ہیں تیرے نجومِ منور
ترے آل و ازواج اشرف و اعظم رسولِ مکرمؐ نبیٔ معظمؐ
نبیوں، رسولوں کا تو پیشوا ہے تو ہادی ہے تو خاتم الانبیاء ہے
نہیں تجھ سے بڑھ کر کوئی ابنِ آدم رسولِ مکرمؐ نبیٔ معظمؐ

ایک بھرپور عالمِ وارفتگی اس وقت پیدا ہو جاتا ہے جب شاعر اپنے ممدوح کو دل و جان سے چاہتا ہے اور اس کے حضور اظہارِ شوق کے موقع پر فصاحت اور بلاغت کا بحرِ ذخار ٹھاٹھیں مار رہا ہوتا ہے۔ ابو البیان ظہور احمد فاتح کے یہ نعتیہ اشعار ملاحظہ ہوں:

تیرا حرف حرف عزیز ہے تیری بات بات سے پیار ہے
تو خلوص و مہر کا مہر ہے تو وفا کا شاہ سوار ہے
یہ فروغِ انجمن جہاں یہ تمدنِ چمن جہاں
تیرا خلق اس کا شباب ہے تیرا دین اس کی بہار ہے
اے رسولِ رحمتِ دو جہاں اے شفیعِ محشرِ مہرباں
تیرا شوق ہے تیرا طوق ہے جو متاعِ فاتحِ زار ہے

میدانِ نعت میں حضرتِ فاتح نے جو ہیئتی تجربے کیے، وہ بھی یقیناً بے حد کامیاب اور نہایت پر اثر رہے ہیں۔ ذیل میں ان کی ایک نعت کا کچھ حصہ ہدیہء قارئین ہے:

فکر تھی تو فقط یہی تھی تجھے
خلق و خالق میں ربط ہو جائے
لوگ ایماندار ہو جائیں
نیکیاں جاندار ہو جائیں
آدمی شاندار ہو جائیں
تیری خواہش تھی آرزو تھی تیری
آدمی باشعور ہو جائے
عام دانش کا نور ہو جائے
خلق دوزخ سے دور ہو جائے

نعت کی حقیقت یہ ہے کہ اس میں ہستیء منعوت کی شان دل کش پیرائیہ میں بیان کی گئی ہو اور اس کے متعلقات کی خوب پذیرائی کی گئی ہو۔ یہی عالم پروفیسر ظہور احمد فاتح کی نعت نگاری میں بدرجہ اتم پایا جاتا ہے۔ کلیات و جزئیات کا بیان بین السطور ایک دل نواز فضا قائم کر دیتا ہے۔ ذیل میں ہم ان کی دس شعری نعت میں سے پانچ اشعار بطور استشہادات لاتے ہیں:

وہ نبی ہوں کہ ولی تیرے وفادار ہیں سب
ہے جنہیں تجھ سے محبت وہ نکو کار ہیں سب
چاہنے والے ترے شوق سے سرشار ہیں سب

ہو مجاہد ہیں جہانگیر ہیں ابرار ہیں سب
وہ رسومات سے بدعات سے بیزار ہیں سب
تیرے درو یش جو ہیں سو درِ شہوار ہیں سب
قیمتی سارے جہاں سے ہیں احادیث تری
غیرتِ لعلِ بدخشاں تیرے افکار ہیں سب
ہے علاجِ دل و جاں نسخۂ قرآن و حدیث
چارہ گر سب کا ہے تو تیرے ہی بیمار ہیں سب

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی شخصیت اور آپ کی جماعت کے خواص کا مذکور زیبِ نعت ہوا کرتا ہے۔ساتھ ہی ساتھ قرآنی تعلیمات اور نبوی منہاج کے حوالے بھی نعت کو پر کشش اور بااثر بنا دیتے ہیں۔حضرت فاتح کا اسلوبِ نعت یقیناً متوازن بھی ہے اور متلون بھی ہے۔ان کی نعت کا قاری ایک ایسے جہانِ رنگ و بو میں پہنچ جاتا ہے جس میں پاکیزگی ہے، معصومیت ہے اور یک گونہ جاں نثاری کی کیفیت پائی جاتی ہے۔ صاحبِ موصوف کے مندرجہ ذیل اشعار زیرِ نظر لایئے:

جس دل میں موجزن ہے محبت رسولؐ کی
اس کے لیے ہے شرطِ اطاعت رسولؐ کی
ہے سب سے شاندار سیاست رسولؐ کی
تھی سب سے بہترین ریاست رسولؐ کی
ہیں بدنصیب لوگ جو اس پہ ہیں معترض
واللہ محترم تھی جماعت رسولؐ کی

رسولِ مکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تخت وتاجِ ختمِ نبوت پر فائز ہیں اور یہ پہلو آپ کی نعت کا ایک بھرپور حوالہ ہے۔ اسی حوالے کو ردیف ٹھہراتے ہوئے ابوالبیان ظہور احمد فاتح نے ایک مسجع نعت قلم بند کی ہے جس کے دو شعر مشتے از خروارے کے مصداق آپ کی نذر کرتے ہیں:

وہ عابد و عقیل بھی مجاہد و کفیل بھی
فہیمِ رازِ کن فکاں نبیٔ آخر الزماںؐ
حدیثِ لطفِ عام بھی نجات کا پیام بھی

حبیبِ ربِ دو جہاں نبیٔ آخر الزماںؐ

سلام عرض کرنا بھی نعت کی ایک روایت رہی ہے۔ یقیناً بہت عمدہ سلام کہے گئے ہیں مگر اپنے خیال میں جو سلام جناب فاتح نے رقم کیے ہیں، انتہائی پر اثر اور دل نواز ہیں۔ ان میں عقیدت کا ٹھاٹھیں مارتا ہوا بحرِ ناپیدا کنار نظر آتا ہے۔ نیاز مندانہ تخاطب، دل پذیری، مہر و محبت، حقیقت و صداقت اور وارفتگی کا ایک ایسا سماں بندھ گیا ہے جو قلبِ مشتاق میں جذب کیے دیتا ہے۔ ذرا ذیل کے اشعار کی تلاوت فرمایئے:

حضور درد کے مارے سلام کہتے ہیں
شکستہ روح کے پارے سلام کہتے ہیں
تمہارے پیار سے دل جن کے جگمگاتے ہیں
زمین کے وہ ستارے سلام کہتے ہیں
حضور آنکھوں میں آنسو لبوں پہ اشک لیے
تمہیں غلام تمہارے سلام کہتے ہیں

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی ذات بابرکات بے حد انقلاب پرور واقع ہوئی۔ آپؐ کے دم قدم سے کمزوروں میں یہ جرات پیدا ہوگئی کہ وہ طاقت وروں کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بات کر سکیں۔ مجبوروں میں یہ صلاحیت پیدا ہوگئی کہ وہ اہلِ جبر سے ٹکرانے لگے۔ انہی احساسات کا اظہار جنابِ فاتح نے ایک نعت کے حسبِ ذیل اشعار میں کچھ یوں کیا ہے:

وجودِ خیر کو وہ جراتیں تو نے سکھائی ہیں
کہ شہر کے سامنے سینہ سپر تیری بدولت ہے
اسے جھکنا بھی تیرے ہی اشارے نے سکھایا ہے
بہت اونچا اگرچہ میرا سر تیری بدولت ہے
کسی نے زندگی قربان کر دی تیری چاہت میں
کوئی دل والا مر کر بھی امر تیری بدولت ہے

کسی نے کیا خوب کہا ہے کہ:

بداز خدا بزرگ توی قصہ مختصر

اسی امر کے مصداق شاعرِ موصوف نے رسول مقبول صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی شرافت کو بابِ زرنگار قرار دیا ہے۔ آپؐ کی امامت کو سب پر فوقیت حاصل ہے اور دعوتِ نبوی کو بشارتِ نجات سے عبارت کیا ہے۔ یہ ہے نعت نگاری کی وہ معراج جو بہت کم شعرا کے ہاں دیکھی جاسکتی ہے۔ ذرا یہ اشعار ملاحظہ فرمائیے:

دی حق نے سند اسے خلقِ عظیم کی
ہے بابِ زرنگار شریعت رسولؐ کی
نظروں میں اس کی کوئی امامت جچی نہیں
تسلیم جس نے کی ہے امامت رسولؐ کی
فاتح قبول جو کرے ہو جائے کامیاب
اک مژدہءِ نجات ہے دعوت رسولؐ کی

استادِ فن ابو البیان ظہور احمد فاتح ندرتِ بیان اور قدرتِ کلام کے وصف سے متصف ہیں۔ وہ بڑے مشکل اور انوکھے قوافی بڑی آسانی اور چابک دستی سے استعمال کرتے ہیں۔ وہ ہیئتی تجربے ہوں یا تلون مضامین، ہر پہلو سے ان کا ہنر دلچسپیوں کا حامل ہے۔ ذرا درج ذیل نعتیہ اشعار کی طرف توجہ کیجئے:

تیری سنت چھوڑ کر کوئی ولی ہو سکتا نہیں
معتبر ہیں تیری نسبت سے مری مجذوبیاں
صرف کر ڈالی ہیں تیری مدحت و توصیف میں
جو عطا کی ہیں خدا نے مجھ کو خوش اسلوبیاں
فاتحِ اذہان ، اذنِ باریابی ہو عطا
ہجر میں اکھیاں ہیں اپنی آنسوؤں میں ڈوبیاں

قدرتِ کلام اور ندرت و رفعتِ بیان کے باوجود شاعر کا عجز و انکسار قابلِ دید ہے۔ جنابِ فاتح اپنے آپ کو خدائی ملفوظات کے مقابلے میں بے بضاعت کہہ رہے ہیں۔ یہ کسرِ نفسی اور خاکساری ایسا جوہرِ حیات بخش ہے جو خوش نصیبوں کو ہی مہیا ہوا کرتا ہے۔ پھر مختلف پہلوؤں کے ساتھ مدحِ پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کرنا اور نئے نئے گوشے اجاگر کرنا بھی یقیناً یک گونہ کمالِ فکر و فن ہے جیسے ان اشعار میں اظہارِ خیال کیا ہے:

لکھے اک بے بضاعت نعت کیا تیری؟
کہ خود تعریف کرتا ہے خدا تیری

زمیں ہے وہ خطۂ جنتِ ارضی
شریعت ہے جہاں جلوہ نما تیری
اسی مشکوٰۃ سے روشن ہے اک دنیا
وہ رہبر ہے خدیثِ بے بہا تیری

مشکل اور دلکش قوافی کا التزام نیز رواں دواں بحورِ سخن فاتح کا خاصا ہے۔ جب تخیل کا ترفع اور بہترین شعری بنت مجتمع ہوجائے تو رنگِ بیان ہی اور ہوجاتا ہے۔ ذیل میں ایک اور نعت کے تین اشعار نقل کیے جاتے ہیں جن سے سخنورِ مذکور کی فنی اپچ اور خوش عقیدگی کا اندازہ بحسنِ خوبی ہوسکے گا:

ہوں ابنِ آمنہ کا میں غلام کیا کم ہے؟
نہ ابنِ ہاجرہ ہوں میں نہ ابنِ سارہ ہوں
مرا جریدۂ دل تیری مدح کا مخزن
مجھے ہے ناز تیری نعت کا شمارہ ہوں
مرا نفود ترے فیض کا حوالہ ہے
تری محبتیں موجیں ہیں میں کنارہ ہوں

حقیقی نعت وہ ہوتی ہے جو مبنی بر واقعیت بھی ہو اور غلو سے مبرا ہو نیز اس میں حقیقت نگاری بھی کی گئی ہو۔ ذیل کے اشعار کے مطالعے سے اس امر کی بخوبی تصدیق ہوجائے گی کہ جنابِ فاتح کا کلام ان اوصاف سے کس قدر بہرہ افروز ہے:

ہر چند آپؐ آئے ہیں سب انبیا کے بعد
مرتبہ ہے اونچا آپؐ کا سب سے خدا کے بعد
حبِ خدا کا ساتھ ہو حبِ رسولؐ بھی
لکھی ہے میں نے نعت بھی حمد و ثنا کے بعد
لگتا ہے ناتمام سا سطحی سا عام سا
ہر قول معتبر ترے حرفِ رسا کے بعد

انسانی قلب عجیب وغریب امنگوں کا مظہر ہے۔ طرح طرح کی آرزوئیں جنم لیتی ہیں۔ بالکل یہی معاملہ اپنے شاعرِ ممدوح کا ہے۔ خصوصاً سرورِ عالم محبوبِ دو جہاں نبی آخر الزماں صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے حوالے سے

جب بات ہو رہی ہو تو رنگِ سخن ہی کچھ اور نکھر جاتا ہے کہ پیارے نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے کیا کیا نسبت حاصل ہے۔ کس کس طریقے سے خدمتِ عالی میں اپنی خدمات پیش کرے۔ کس کس انداز سے بارگاہِ نبوی میں آداب بجالائے۔ ان امنگوں کی عکاسی ابوالبیان ظہور احمد فاتح کے حسبِ ذیل اشعار سے ہوتی ہے:

زہے قسمت جو میں تسمہ ترے نعلین کا ہوتا
مری معراج ہوتی تیرے قدموں سے لگا ہوتا
ترا دربان بن جاتا رفیع الشان بن جاتا
زہے قسمت جو میں تیرا رفیقِ خوش ادا ہوتا
مری قسمت پہ فاتح رشک آتا چاند سورج کو
تری فرقت میں جلتا میں ترے گھر کا دیا ہوتا

سلسلۂ نعت جوں جوں آگے بڑھتا چلا جاتا ہے، محبت کی شدت بڑھتی چلی جاتی ہے۔ یہاں تک کہ محبِ محبوب کے حضور سب کچھ نچھاور کرنے پر تیار ہو جاتا ہے اور تمام تر جلیل القدر ہستیاں اس ذاتِ ستودہ صفات کی خوشہ چین و نیاز مند محسوس ہونے لگتی ہیں۔ یہ جنابِ فاتح کا خاص رنگ ہے جس کی جھلک ان تین اشعار میں دیکھی جاسکتی ہے:

سلام سارے پیام سارے
سخن مرے تیرے نام سارے
ہیں تیرے آئین کے سوالی
جہاں کے دلکش نظام سارے
جہاں کے حاکم تری رعایا
ہیں تیرے پیرو امام سارے

اللہ کے محبوب نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی مدحت گویا سنت اللہ ہے۔ آپؐ کی جلالتِ شان کا یہ عالم ہے کہ دنیا کی عظیم شخصیات آپؐ کی حاشیہ نشین ہیں اور اہلِ شوق کا منتہائے مقصود اس دل آویز شخصیت کی زیارت ہے اور آپ کی آخری آرامگاہ کا دیدار ہے۔ جنابِ فاتح نے چشمِ تصور سے ہی درشن کرا دیے ہیں۔ نعت گوئی کا حسن ان اشعار میں ملاحظہ ہو:

کیا حسن کیا وقار ہے پیارے رسولؐ کا؟

مداح کردگار ہے پیارے رسولؐ کا
اے اہلِ شوق چشمِ تصور تو وا کرو
وہ سامنے مزار ہے پیارے رسولؐ کا
صدیق ہو عمر ہو غنی ہو کہ بوتراب
ہر ایک غمگسار ہے پیارے رسولؐ کا

تضمین نگاری منظومات کی ذیل میں ایک زبردست فن کا درجہ رکھتی ہے۔ بڑے بڑے شعرا کے ہاں اس کی مثالیں ملتی ہیں۔ ابو البیان ظہور احمد فاتح بھی فنِ تضمین میں کسی سے پیچھے نہیں رہے بلکہ انصاف کی بات یہ ہے کہ وہ کچھ آگے ہی نظر آتے ہیں۔ جان محمد قدسی کی فارسی نعت جسے قبولِ عام کا درجہ حاصل ہے، اس کی تضمین جنابِ فاتح نے اس خوبی سے کی ہے کہ عقل دنگ رہ جاتی ہے اور نعت کا تاثر دوبالا ہو جاتا ہے۔ ان کا ایک بند برائے ملاحظہ قارئین نقل کیا جاتا ہے:

آپؐ کی ذاتِ مقدس پہ درود و سلام
آپؐ کی نعت کا اعجاز ہے تحسینِ کلام
ضامنِ اوجِ بشر آپ کا جاں بخشیں پیام
"نخلِ بستانِ مدینہ تو سر بسر تمام
زاں شد شہرہء آفاق بشریں رطبی"

مدینۃ النبی وارفتگانِ حبِ رسول کے لیے منزلِ مقصود کا درجہ رکھتا ہے۔ کاروانِ اہلِ ایمان کے لیے شعرائے نعت بیان دورانِ نعت مدینہ منورہ کو بھی بہت یاد کرتے ہیں اور اس شہرِ مقدس کے ذکرِ خیر سے رطب اللسان رہتے ہیں۔ وہاں پروفیسر ظہور احمد فاتح کے ہاں بھی جگہ جگہ یادِ مدینہ ذوق وشوقِ حبِ مدینہ اور دیدارِ مدینہ کی کیفیتیں پائی جاتی ہیں۔ بطور مشتے از خروارے دو شعر پیشِ خدمت ہیں:

بیمارِ محبت کے لبوں پر یہ دعا ہے
یا رب ہمیں اک بار نظر آئے مدینہ
رکھے جسے پابندِ سنن ذوقِ اطاعت
ہوتا ہے وہی عاشقِ آقائے مدینہ

آمدِ حضور اور عالمی منظر نامہ ایک مستقل موضوعِ نعت رہا ہے جس میں کہیں تصورات کی کارفرمائی

ہوتی ہے تو کہیں واقعات کا تار و بود ہوتا ہے۔ کہیں اسوۂ حسنہ کی ضوفشانی کے اثرات کا بیان ہوتا ہے تو کہیں آمدِ رسول صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے حوالے ابو البیان ظہور احمد فاتح کی ایک بھر پور نعت کے دو اشعار آپ کے ذوقِ جمیل کی نذر کرتے ہیں:

مگر نہ مطلق شریر لوگوں کو بد دعا دی
اگرچہ طائف سے کھا کے پتھر حضور آئے
مگر سدا فقر ہی کیا اختیار فاتح؟
اگرچہ بن کے جہاں کے سرور حضور آئے

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی حیاتِ طیبہ ایک بابِ درخشاں ہے۔ ایک کتابِ سعادت ہے۔ دفترِ روزگار ہے۔ جس کی نسبت سے شعرا اپنے اپنے انداز میں اظہارِ خیال کرتے ہیں۔ یہاں ہم حضرتِ فاتح کے فحوائے سخن میں سے چند قارئین کے لیے پیش کر رہے ہیں:

خون کے پیاسوں کو لاتثریب تو نے کہہ دیا
ایسے دشمن تھے جو دکھ دیتے رہے برسوں تجھے
عبد ہے تو ، عبدہ ہے اور عبدِ خاص ہے
فخرِ عام نازشِ انساں سمجھتا ہوں تجھے

دل کی چاہتیں اور مطالبات بھی عجیب ہیں۔ کسی نے کیا خوب کہا ہے:

انوکھالا ڈلا کھیلن کو مانگے چاند

محبِ رسول کا دل طیبہ و بطحا کے مناظر کے درشن چاہتا ہے جس کا اظہار ظہور احمد فاتح نے اپنی نعت میں یوں کیا ہے:

یہ چاہتا ہے فضائے بطحا، یہ مانگتا ہے ہوائے طیبہ
کہ میرے دل کو نہیں سکون و قرار تجھ بن رسولِ اکرمؐ

تعلیماتِ نبوی کے حوالے جگہ جگہ پروفیسر ظہور احمد فاتح کی نعتوں میں نمایاں طور پر پائے جاتے ہیں اور بعض اوقات عربی سیاق و سباق سمیت بہار دکھاتے نظر آتے ہیں جیسے ان کا یہ شعر ہے:

ہے برائے آخرت زریں سبق
لیس للانسان الا ماسعیٰ

ان کی نعتیں کتنی گہری اور کتنی ڈوب کر لکھی ہوئی ہیں، اس کا ادراک خود انہیں بھی اچھی طرح ہے اور داد و تحسین کے اسلامی انداز کیا ہیں، اس سے بھی بخوبی آگاہ ہیں۔ لہٰذا اپنے ایک نعتیہ شعر میں وہ کچھ اس طرح سخن سرا نظر آتے ہیں:

فاتح نے ایسی ڈوب کے نعتِ نبی کہی ہے
صلی علیٰ کہا ہے خواص و عوام نے

کراچی کے واسطۂ وارثیہ نے ایک عرصہ سے مخصوص ردیفوں میں نعتیہ مشاعرے کرانے کا سلسلہ شروع کیا ہے۔ اسی نوعیت کے ایک مشاعرہ منعقدہ بمقام وہوا تحصیل تونسہ شریف ضلع ڈیرہ غازی خان میں ابوالبیان ظہور احمد فاتح نے دی گئی ردیف ''چمک دمک'' کی نسبت سے ایک بھرپور نعت کہی تھی جو بہت پسند کی گئی تھی۔ اس کے دو شعر آپ کے حسنِ ذوق کی نذر کیے جاتے ہیں:

ہیں برکتیں ضیائے کتاب و حدیث کی
ہے چار دانگ دینِ مبیں کی چمک دمک
فاتح دل و دماغ میں یوں جو ہے روشنی
ساری ہے اپنی من کے مکیں کی چمک دمک

سخن ور اپنے وظیفۂ حیات سے آشنا ہے۔ بحیثیت مسلمان اور بطور دین دار شاعر اپنی ذمہ داری کو سمجھتا ہے اور اس کا اظہار حضرتِ فاتح نے اپنے الفاظ میں کیا ہے۔ ذرا دیکھیے کیا عالمِ جمال و کمال ہے:

جب بھی لو دے اٹھی شمع یادِ نبیؐ نعت ہم نے کہی
جس گھڑی بے کلی حد سے بڑھنے لگی نعت ہم نے کہی

ایک اور نعت جو اسوہ ٔ حسنہ سے معنون ہے، جس کی ردیف ''سنتِ نبیؐ'' ہے، بے حد پر اثر اور پر فکر ہے۔ جس میں دعوتِ الی الخیر بھرپور انداز میں دی گئی ہے۔ اس کے دو شعر یہاں نقل کیے جاتے ہیں جن سے پتہ چلتا ہے کہ جنابِ فاتح کتنی عمیق دینی فکر رکھتے ہیں اور اسوہ ٔ حسنیٰ سے ان کی کتنی گہری وابستگی ہے۔ حقیقت میں وہ ایک عالمِ باعمل بھی اور شاعرِ حق بیاں بھی۔ وہ داعی الخیر بھی ہیں اور مرشدِ صلاح بھی۔

کبھی بھی منہ نہ موڑنا حدیثِ آنحضورؐ سے
فلاحِ ذات کا ہے اعتبار سنتِ نبیؐ
نبیؐ سے پیار ہے اگر تو تھام لے حدیث کو

شجر ہے دین اور برگ و بارِ سنتِ نبیؐ

وہ پیارے نبیؐ سے بڑی عقیدت و محبت سے مخاطب ہوتے ہیں اور بین السطور اوصافِ پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے اپنے قاری کو روشناس کراتے چلے جاتے ہیں۔ ان کے ہاں نعت ایک وسیلۂ نجات اور ذریعۂ سعادت ہی نہیں، ایک اعلیٰ تر مقصدیت کی حامل ہے۔ ان کا یہ شعر دیکھیے:

تیرے فرقِ ناز پر ختمِ نبوت کا ہے تاج
تو خدا کا بندۂ ذیشاں رسولِ مہرباںؐ

ابوالبیان ظہور احمد فاتح کے کلام کا لسانی تجزیہ کیا جائے تو اس میں عربیت بھرپور انداز میں پائی جاتی ہے۔ ساتھ ہی ساتھ ان کی نظر میں مصطفوی ہونا بھی ایک بہت بڑے اعزاز کی بات ہے۔ ان دو شعروں میں ان کے یہ کوائف بدرجہ اتم موجود ہیں:

آئے نظر عقاب سب عصفور کی طرح
بھرنے لگے اڑان جب شاہینِ مصطفیٰؐ
فاتح نجات پا گیا وہ خوش نصیب شخص
اپنایا جس نے اسوۂ زرینِ مصطفیٰؐ

وہ قصیدہ ہو یا حمد و نعت، ہر صنف میں دعا کا پہلو اہلِ سخن ضرور نکالتے ہیں۔ جنابِ فاتح بھی اس میں پیچھے نہیں ہیں۔ ان کے دعائیہ اشعار بہت جامع اور پراثر ہوتے ہیں۔ لیجیے اس قبیل کے دو شعر دیکھیے:

مجھ کو مطلوب ہدایت کی ہوا ہے یا رب
میرے حصے میں مودت کا نگینہ آئے
میں نہ غافل رہوں ارشادِ نبیؐ سے فاتح
کوئی ساعت کوئی دن کوئی مہینہ آئے

حضرتِ فاتح کی کتاب کا مطالعہ کرتے ہوئے ہم اختتامِ کتاب پر آ پہنچے ہیں مگر آخری نعت ایسی بھرپور ہے کہ ازراہِ انتخاب ہم نے دو ایک شعر منتخب کرنا چاہے مگر سعیِ بسیار کے باوجود بھی ہم دس اشعار پر مشتمل نعت میں سے بمشکل پانچ اشعار ہی چھوڑ سکے ہیں۔ باقی پانچ اشعار اس پائے کے ہیں کہ ان سے صرفِ نظر کرنا محال ہے۔ طولِ مضمون سے بچنے کے لیے ہم یہ بلاتبصرہ ہی ہدیۂ قارئین کرتے ہیں۔ آپ دیکھیں گے کہ انہیں اظہارِ خیال پر کس قدر قدرت حاصل ہے۔ ان کا بیان خود میں کتنی پنہائیاں سموئے

ہوئے ہے:

ہیں ان کے نور سے روشن ضمیر و روح کے رشتے
جو دانش کر گئے نقشِ دل پر پاک پیغمبرؐ
جو تھے پہلے عذاب ہو گئے منسوخ وہ سارے
شریعت دے گئے سب سے بہتر پاک پیغمبرؐ
مساوات واخوت، عدل واحساں، رحمت وراحت
مزین کر گئے ہستی سراسر پاک پیغمبرؐ
جو ظالم بدعتی اسلام کے بخیے ادھیڑے گا
سفارش اس کی فرمائیں گے کیوں کر پاک پیغمبرؐ؟
محمدؐ کی اطاعت ہی محمدؐ کی محبت ہے
کہ فاتح دل کے ہیں محبوب داور پاک پیغمبرؐ

حاصلِ کلام یہ ہے کہ ابوالبیان ظہور احمد فاتح کا نعتیہ مجموعہ کلام ''سلام کہتے ہیں'' ایک معرکۃ الآرا پیشکش ہے جو نہ صرف فکری حوالوں سے مالا مال ہے بلکہ قابلِ ذکر فنی پہلو بھی رکھتی ہے جس میں شاعر موصوف نے بڑا دل کش اسلوب اپنایا ہے۔ رواں دواں بحور ہیں جن میں بھرپور تنوع پایا جاتا ہے۔ بڑے دل کش اور نادر قوافی استعمال کیے گئے ہیں۔ اسی طرح ردیفیں بھی معقول نعتیہ مناسبت رکھتی ہیں جن میں رسول ختمی مرتبت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اسمائے گرامی اور اوصافِ حمیدہ کی نسبت سے تخاطب ہے نیز محبت و عقیدت کے کوائف اور درود وسلام کے وظائف سے جدا حسن محسوس ہوتے ہیں۔ بعض بحروں میں ادب آمیز ٹھہراؤ ہے اور بعض بحریں رنگِ امنگ کی حامل ہیں۔ اسی طرح جنابِ فاتح کے ہاں نعتیہ اسلوب کے شاندار تحقیقی وتنقیدی ادراکات جا بجا بہار دکھاتے نظر آتے ہیں۔ جنہیں ہم نعتیہ ادب کے زریں مبادی قرار دے سکتے ہیں۔ قرآن وحدیث کی خالص تعلیمات کی روشنی، افراط وتفریط سے مبرا اور غلو سے عاری سخن قاری کی تدریس وتدریج کے لیے دستیاب ہے۔ ابوالبیان ظہور احمد فاتح ایک راسخ العقیدہ مسلمان ہیں اور سنی سنائی باتوں پر کم یقین رکھتے ہیں۔ لہٰذا مستند حوالوں کے تناظر میں سخن سنجی کرتے ہیں۔ ہم نے محسوس کیا کہ روایتی عشقِ رسول والی گفتگو سے انہوں نے شعوری طور پر گریز کیا ہے کیونکہ عشق میں جنوں کا عنصر پایا جاتا ہے جو الفتِ رسولؐ کے شایانِ شان نہیں لہٰذا انہوں نے حبِ رسول کی ترکیب استعمال کی

ہے جو ان کا ایک منفرد تحقیقی زاویۂ فکر ہے جسے قبل ازیں نعت نگاری میں بروئے کار نہیں لایا گیا۔ شعراء معراج کے حوالے سے بغیر سوچے سمجھے بلاتحقیق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کو عرش پر تشریف فرما بیان کرتے ہیں جو خلافِ واقعہ ہے۔ قرآن و حدیث میں کامل صراحت پائی جاتی ہے کہ آپؐ کا یہ سفر سدرۃ المنتہی تک تھا۔ اسی طرح یار لوگ معجزات کے بیان میں بھی ذرا احتیاط سے کام نہیں لیتے۔ کئی غیر ثابت شدہ اور بلاتحقیق مواد شامل کر دیتے ہیں جو معیارِ سنت کو متاثر کرتا ہے۔ اگر اس ضمن میں ذرا بھی حقیقت پسندی اور واقعیت نگاری کو پیشِ نظر رکھا جائے تو یہ صورتِ حال پیدا نہ ہو سکے۔

الغرض جنابِ فاتح نے ایک نہایت متوازن انداز میں شاندار مطالعاتی اور علمی و فنی اسلوب کی نمائندگی کی ہے۔ اگر یہ کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا کہ ابوالبیان ظہور احمد فاتح نے پیرائیۂ نعت میں سیرت النبیؐ مجمل و مفصل دونوں انداز میں بیان کی ہے اور ارشاداتِ رسول صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے حوالے دے کر آپؐ کی اتباع و اطاعت کی طرف اپنے قاری کی توجہ مبذول کرائی ہے۔ بہ الفاظ دیگر انہوں نے اپنی نعت نگاری کو تبلیغِ دین کا ذریعہ بنایا ہے۔ ہماری دعا ہے کہ مالک القدوس انہیں ان کاوش پر اجرِ جزیل عطا فرمائے۔ (آمین)

ابوالبیان ظہور احمد فاتح کی شاعری اور اسلامی خدوخال

اللہ رب العزت نے حضرت انسان کو تخلیق فرمایا اور اسے وجدان و شعور نیز علم و فضل سے آراستہ و پیراستہ فرمایا۔ علم و عرفان میں سب سے پہلا درجہ دین کا ہے اور اللہ تبارک و تعالیٰ کا پسندیدہ دین اسلام ہے جس کے بارے میں یہ ارشاد ہوا ہے کہ جس نے اسلام کے علاوہ اور کوئی دین اختیار کیا تو وہ اس سے قبول نہ کیا جائے گا کیونکہ اسلام ایک مکمل ضابطۂ حیات ہے۔ یہ دینِ فطرت ہے اور ہر پیدا ہونے والا اسی فطرت پر پیدا ہوتا ہے۔ لہٰذا وہ انسان خوش نصیب ہے جسے اس حقیقت کا استحضار نصیب ہو جائے۔ اس پر مستزاد یہ کہ وہ شاعر ہوتے ہوئے پوری بصیرت کے ساتھ اسلام پر یقین و ایمان رکھتا ہو۔ اسی پر کاربند ہو۔ اس کے عقائد کو حرزِ جاں جانتا ہو۔ اس کی اقدار و روایت پر جاں چھڑکتا ہو۔

اس تناظر میں اگر ہم حیاتِ فاتح کا جائزہ لیں اور اس کے فکری میلانات کو پرکھیں تو یہ بات اظہر من الشّمس ہو جاتی ہے کہ موصوف جس طرح اپنی عملی زندگی میں ایک راسخ العقیدہ مسلمان ہیں، اسی طرح ان کے سخن پر بھی گہری دینی چھاپ ہے۔ ذیل میں ہم ان کی منظومات کے تناظر میں ان کی دو کتابوں ''ساری بھول ہماری تھی'' مطبوعہ جنوری 2003ء اور ''سنہرے خواب مت دیکھو'' مطبوعہ دسمبر 2004ء کی ابتدائی دو نظموں کے حوالے سے نظائر پیش کر رہے ہیں جس سے یہ اندازہ بخوبی لگایا جاسکے گا کہ وہ اپنے کلام میں اسلامی خدوخال کس درجہ وسیع و عمیق رکھتے ہیں:

(الف)

مجھے رنج و مصیبت سے بچاتی ہے دعا تیری
کڑے طوفان سے بھی کھینچ لاتی ہے دعا تیری
مرا جیون ہے میرا رزق ہے میرا مقدر ہے
مری ہستی کو راحت سے سجاتی ہے دعا تیری
مجھے جب یاس کی تاریکیاں بے تاب کرتی ہیں
شعاعِ نور بن کر مسکراتی ہے دعا تیری
کوئی نخوت کا مارا جب مجھے دھتکار دیتا ہے
تو ممتا بن کے سینے سے لگاتی ہے دعا تیری
مجھے بے خواب کر دیتی ہے کوئی پریشانی
سکوں کی لوریاں مجھ کو سناتی ہے دعا تیری
مجھے ہلکان کر دیتی ہے جب دکھ درد کی یورش
مری خاطر خوشی کے گیت گاتی ہے دعا تیری
مری ہمدرد ہے غم خوار ہے ساتھی ہے مونس ہے
مری تذلیل پر آنسو بہاتی ہے دعا تیری
کہیں ٹھوکر اگر کھاؤں کہیں ناگاہ گر جاؤں
پکڑ کر پیار سے بازو اٹھاتی ہے دعا تیری
مری ماں بس مجھے تیری دعا کی ہی ضرورت ہے
کوئی مشکل ہو میرے کام آتی ہے دعا تیری
اے میری محسنہ تیری دعا میرا اثاثہ ہے
رُلاتا ہے زمانہ تو ہنساتی ہے دعا تیری
خفا ہو کر کبھی یہ سلسلہ موقوف مت کرنا
کہ میرا حوصلہ ہر دم بڑھاتی ہے دعا تیری

(''ساری بھول ہماری تھی''۔نظم: ماں کی دعا۔صفحہ 116-115)

ماں کا رشتہ آفاقی حیثیت رکھتا ہے۔ یہ وہ حرفِ معتبر ہے جسے ہر دور، ہر سماج اور ہر دین دھرم میں

مقامِ تکریم وادب حاصل ہے۔ اسلام میں اللہ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بعد ماں کا مقام ومرتبہ ہے۔ اللہ تبارک وتعالیٰ کی آفاقی کتاب قرآن مجید میں ارشادِ ربِ کریم ہے کہ ''اور ماں باپ کے ساتھ حسنِ سلوک سے پیش آؤ''۔ جنابِ فاتح اس سلسلے میں اس قدر مخلص واقع ہوئے ہیں کہ انھوں نے اپنی اس شاندار کتاب ''ساری بھول ہماری تھی'' کا انتساب والدہ ماجدہ کے نام کیا ہے۔ چنانچہ لکھتے ہیں:

(ب)

اے کہ تیرے نام کا حامل ہے نجمِ آسماں
تو علامت ہے وفا کی تو محبت کا نشاں
کم ہی دیکھا کوئی تجھ سا شفیق و مہرباں
معتبر تیرے حوالے سے ہے میری داستاں
اے کہ تیرا نطق ہے بنیاد میرے شعر کی
اور تیری ذات کا پرتو ہیں میری خوبیاں
رنگ میرے نقشۂ ہستی میں تو نے بھر دیے
منحصر تیری دعا پر ہے میرا آرامِ جاں

آپ نے ملاحظہ کیا کہ کس قدر والہانہ پن، محبت وعقیدت ماں سے اس فرزندِ شعروادب کو ہے۔ یہاں تک کہ وہ اپنے شاعر ہونے کا جواز بھی وجودِ مادر کو سمجھتے ہیں۔

آیئے اب ہم مندرجہ بالا نظم کی نسبت سے جائزہ لیتے ہیں۔ نظم کا عنوان ''ماں کی دعا'' ہے۔ سیانے کہتے ہیں کہ ماں کی دعا جنت کی ہوا ہوتی ہے۔ جو انسانی فتوحات کے لیے کمک کا درجہ رکھتی ہے۔ فاتح جی فرماتے ہیں کہ اے میری ماں تیری دعا مجھے ہر مصیبت سے چھڑاتی ہے۔ خوف ناک طوفانوں کے تھپیڑوں سے بچاتی ہے۔ تیری دعا ہی میری زندگی ہے۔ میرا مقدر ہے۔ میرا رزق ہے۔ مجھے خوشیاں بھی اسی کی بدولت ملتی ہیں۔ ظلمتِ یاس میں یہ شعاعِ نور ہے۔ یہ اس وقت بھی میری دلداری کرتا ہے جب مغرور لوگ بصد حقارت مجھے دھتکار دیتے ہیں۔ تیری دعا میرے لیے سکون افزا لوری ثابت ہوتی ہے۔ جب پریشانیاں مجھے بے خواب کر دیتی ہیں۔ تیری دعا میرے لیے اس وقت نشاط انگیز ثابت ہوتی ہے جب غم و درد کی یرقشیں مجھے ہلکان کر دیتی ہیں۔ مادرِ ذیشان تیری دعائیں میرے لیے ہمدرد و مونس ثابت ہوتی ہیں جب لوگ آمادۂ تذلیل ہوں۔ یہ تیری نیک تمنائیں ہی ہیں جو افتادگی میں بھی دستگیری

کرتی ہیں۔لہٰذا میں تیری دعاؤں کا خواستگار ہوں جو ہر مشکل میں میرے کام آنے والی ہوں۔تو میری محسنہ ہے۔تیری دعائیں ہی مجھے مطلوب ہیں کیونکہ زمانہ جب مجھے رلاتا ہے تو یہ سامانِ دل بستگی کرتی ہیں۔لہٰذا دعاؤں کا یہ سلسلہ منقطع نہ ہونے دینا کیونکہ یہ وہ اثاثہ ہے جس کے باعث میرا حوصلہ بحال رہتا ہے۔میری ہمت جوالا رہتی ہے۔

مجموعی طور پر یہ نظم اسلامی فکر کا بہترین حوالہ ہے جو ایک فرزندِ مومن کے دل کی آواز ہے۔شاعر نے شدتِ احساسات کی عکاسی کی ہے۔یہ نظم جزئیات نگاری کی عمدہ تمثیل ہے اور والدہ سے محبت وعقیدت کی منہ بولتی تصویر ہے۔

(ج)

ترے بھی دکھ ہیں مرے بھی دکھ ہیں
تجھے یہ دکھ ہے کہ مال و دولت نہیں ترے پاس کیوں بکثرت؟
تجھے یہ دکھ ہے کہ ساز و ساماں نہیں ترے پاس کیوں فراواں؟
تجھے یہ دکھ ہے کہ جاہ و منصب ترے مقدر میں کیوں نہیں ہے؟
مگر مرے دکھ ہیں مختلف سے
مجھے یہ دکھ ہے کہ میری ہستی میں کیوں بہت سی برائیاں ہیں؟
مجھے یہ دکھ ہے کہ اپنے آقا کے حکم پورے نہیں کیے ہیں
مجھے یہ دکھ ہے کہ میرے گھر میں خدا کے فرمان ٹوٹتے ہیں
مجھے یہ دکھ ہے کہ میرے وطن میں نبیؐ کے احکام چھوٹتے ہیں
مجھے یہ دکھ ہے کہ میری ملت زوال کی زد میں آچکی ہے
مجھے یہ دکھ ہے کہ قومِ مسلم بہت خطا کار ہوگئی ہے
یہ اتنی کمزور ہوگئی ہے کہ آج دنیا کے کافروں نے شکار اس کو سمجھ لیا ہے
جو میرے دکھ ہیں غضب کے دکھ ہیں یہ دکھ دل وجاں کو چیرتے ہیں
یہ دکھ کبھی اشک بن کے آنکھوں سے جھانکتے ہیں
یہ دکھ کبھی آہ بن کے ہونٹوں پہ کھیلتے ہیں

(''ساری بھول ہماری تھی''۔نظم: دکھ اپنے اپنے۔صفحہ 44)

دنیادارالمحن اور بیت الالم ہے۔ یہاں شاذ ہی کوئی آدمی ہدفِ آلام ہونے سے بچا ہوگا۔

گوتم نے سچ کہا تھا
دنیا ہے گھر دکھوں کا

البتہ ہر ایک کے دکھ اپنے اپنے ہیں جن کے مختلف زاویے اور جہتیں ہیں۔ کوئی غمِ جاناں میں مبتلا ہے تو کوئی غمِ روزگار میں لیکن جنابِ فاتح اس قسم کے غموں کو خاطر میں ہی نہیں لاتے ہیں۔ وہ خالص دینی فکر رکھنے والے انسان ہیں۔ چنانچہ ان کے بقول ان کے دکھ بھی اسی نوعیت کے ہیں جن کا تعلق دینی نقصانات سے ہے کیونکہ ایسے نقصانات کے اثرات کافی دوررس ہوتے ہیں۔ دونوں جہانوں سے ان کا تعلق ہے۔

شاعر کو یہ غم کھائے جا رہا ہے کہ وہ بہت سی برائیوں میں مبتلا ہے۔ اسے یہ رنج ہے کہ اپنے رب رحمان کے احکام کی بجا آوری میں اس سے کوتاہی ہو جاتی ہے۔ اسے یہ شکوہ ہے کہ اس کے اہلِ خانہ فرامینِ الٰہی کی خلاف ورزی کر جاتے ہیں۔ حضرتِ فاتح بڑے دکھ سے یہ اعتراف کرتے ہیں کہ ان سے پیارے نبی صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے ارشادات کی تعمیل پوری طرح سے نہیں ہو پاتی۔ انہیں یہ تاسف ہے کہ ان کی دنیا جو دراصل خدا کی دنیا ہے، شیاطین کی عمل داری میں کیوں ہے؟ ایک بڑا دکھ یہ بھی ہے کہ ملتِ اسلامیہ آئے دن مائل بہ زوال ہے۔ مسلمانوں میں جرائم کی شرح بڑھ گئی ہے۔ اپنی قوم آج اس مقامِ ضعف پر آ پہنچی ہے کہ طواغیتِ زمانہ اسے تر نوالہ سمجھنے لگے ہیں۔ لہٰذا کوئی معمولی دکھ نہیں ہے۔ انہیں دل دوز اور جگر سوز کہا جاتا ہے۔ ان دکھوں کا انخلا کبھی آنسوؤں کی صورت میں ہوتا ہے تو کبھی آہوں کا روپ دھار لیتے ہیں۔

گویا ابوالبیان ظہور احمد فاتح کے سلسلہ ہائے رنج و غم ذاتی حوالے سے بڑھ کر شائی حوالہ رکھتے ہیں۔ ان کی حسیات انفرادی نہیں بلکہ اجتماعی ہیں جنہوں نے آفاقیت کا رنگ اختیار کر لیا ہے۔

(د)

خالقِ کائنات و مالکِ کل
آج دل میں امنگ جاگی ہے
تیری حمد و ثنا کروں اتنی
لفظ و معنی جو دسترس میں ہیں

تیری خدمت میں صرف کر ڈالوں

تیری تسبیح میں کروں اتنی

تیری تحمید ہو بیاں ایسی

پیڑ سارے قلم بنا ڈالوں

بحر سب روشنائی ہو جائیں

سارے اوراق صرف ہو جائیں

ہفت افلاک ہوں ورق چاہے

تیری توصیف عام ہو جائے

تیری توحید کی سحر پھوٹے

تیری تمجید کا اجالا ہو

شمسِ تقدیس اوج پر آئے

چاہے جیون کی شام ہو جائے

تیری تعریف عام ہو جائے

چاند نکلے ترے تجمل کا

تارہ تارہ ہو کوکبِ دُری

تیری تنویر کی بدولت ہی

تیری حمد و ثنا کروں ہر دم

مجھ کو توفیق دے مرے آقا

سونے چاندی کے حرف ہوں میرے

اس میں اوقات صرف ہوں میرے

(''سنہرے خواب مت دیکھو''۔ نظم: حمد ربِ ذوالعرش۔ صفحہ 13-14)

اللہ رب العزت سب کا مالک و خالق ہے۔ اسی رزاق کے حضور شعرا حمد گزار ہوتے ہیں مگر زیرِ نظر حمد اس اعتبار سے کافی منفرد ہے کہ اس میں قرآنی حوالے استعمال ہوئے ہیں۔ مثلاً درختوں کا قلم بن جانا، سمندروں کا روشنائی ہونا۔ کلماتِ الٰہیہ کا سلسلہ پھر بھی تمام نہ ہونا معبودِ حقیقی کی تمجید و تقدیس کے لیے وہ

شاندار استعارے لائے ہیں اپنے آقا و مولا سے محبت کے تموج کا اظہار ہے۔ اپنے اوقات کا بہترین مصرف ان کے نزدیک ثنائے ایزدی ہے۔ یہ بھی ایک گونہ عبادت ہے۔

فکری اعتبار سے یہ ایک بھرپور شہ پارہ ہے جو گہری دینی سوچ کا غماز ہے۔ ہیئتی لحاظ سے بھی نظم ہذا قابلِ توجہ ہے کیونکہ اس میں ایک زبردست تمثیلاتی انداز کارفرما ہے۔ تراکیب کی بندش نہایت چست ہے ہر چند کہ یہ ایک آزاد نظم ہے پھر بھی اس میں پابند نظم کے خصائص ملتے ہیں۔ داخلی قوافی اپنی بہار دکھا رہے ہیں۔ سلاست و روانی زوروں پر ہے۔ ایک بلا کا تسلسل ہے جیسے بحرِ مواج ہو۔ قسمت سے ہی ایسی تخلیقات منصۂ شہود پر آتی ہیں جو قاری کے لیے ضیافتِ طبع اور نعمتِ یغمہ ثابت ہوتی ہیں۔

(ر)

پہروں خیال سیدِ بطحا کیے ہوئے
بیٹھے رہیں گے دل میں اجالا کیے ہوئے
خیرہ کرے گا چشم کو سیلِ تجلیات
رہیے تصورِ رُخِ زیبا کیے ہوئے
ہیں مستقل مزاج ہم ایمان کے طفیل
کفار ہیں قیامتیں برپا کیے ہوئے
یوں ہم نے دل کو مصحفِ سیرت بنا لیا
اوصافِ دل نشیں ترے یکجا کیے ہوئے
مصروف ہیں عبادتِ خالق میں اس طرح
بیٹھے ہیں تیرے حسن کا چرچا کیے ہوئے

(''سنہرے خواب مت دیکھو''۔ نظم: نعتِ سرورِ کونینؐ۔ صفحہ 13-14)

رسولِ مقبول صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی ذاتِ بابرکات اہلِ ایمان کی آنکھوں کا نور اور دل کا سرور ہے۔ آپؐ کی نسبت سے مومن شعرا نے تو لامحالہ طبع آزمائی کی ہے، غیر مسلم شعرا نے بھی آپ کی بارگاہ میں بھرپور خراجِ تحسین پیش کیا ہے۔ پروفیسر ظہور احمد فاتح نے مندرجہ بالا نعت میں گہری قلبی وابستگی اور والہانہ پن کا جو اظہار کیا ہے، وہ دامنِ دل کو اپنی طرف کھینچتا ہے۔

وہ لکھتے ہیں کہ زندگی کو اس رخ میں ڈھالیں گے کہ پہروں تک شاہِ بطحا کے خیال و تصور میں بیٹھے

رہیں گے اور یوں ان پاکیزہ خیالات سے جہانِ دل کو اُجالتے رہیں گے۔ ہماری چشمِ تصور ان کے رخِ زیبا سے پھوٹنے والی تجلیات سے خیرہ ہوتی رہے گی۔ اگرچہ فضائے دنیا دگرگوں ہے، کفار نے طوفانِ بدتمیزی بپا کر رکھا ہے، تاہم آپؐ کی تعلیمات اور آپ پر ایمانِ محکم کی برکت سے ہم مستقل مزاج ہیں۔ ہمارا مقصد اسلامی انقلاب ہے تا کہ فساداتِ عالم کا ازالہ ہو۔ ہم نے پاک پیغمبر کے اسوۂ حسنہ کا بیان اس جامع انداز میں کیا ہے کہ اپنی بیاضِ دل کو مصحفِ سیرت بنالیا ہے۔ اے خدا کے پیارے رسول ﷺ ہم جو تیری نعت لکھتے ہیں، یہ دراصل تیرا بیانِ حسن ہے۔ گویا نعت نگاری کر کے ہم تیرے حسن و جمال کا چرچا کرتے ہیں۔ آپ صانعِ جہاں کا شہکار ہیں اور آپ کی تعریف گویا ثنائے ایزدی ہے۔ جسے ہم عبادتِ پروردگار سے موسوم کر سکتے ہیں۔ جیسے غالبؔ نے کہا تھا:

مصروفِ حق ہوں بندگیٔ بوتراب میں

بیانِ غالبؔ کو غلو قرار دیا جاسکتا ہے تاہم ابوالبیان ظہور احمد فاتح کا سخن غیر مبہم اور غلو سے مبرا ہے۔

اللہ تعالیٰ نے انسان کو فکر و شعور کی جو خاصیت ودیعت کی ہے وہ اسے ممتاز بنا رہی ہے۔ بنی نوعِ انسان مختلف افکار اور متنوع نظریوں سے مملو ہے۔ جو کوئی جہاں ہے وہاں خود کو معتبر سمجھتا ہے۔ ہمارے نزدیک یہ امر الحمد للہ لائقِ افتخار و طمانیت ہے کہ جناب ظہور احمد فاتح دینی سوچ رکھنے والے ایک سربرآوردہ شاعر ہیں جو خدا اور رسول ﷺ کی غلامی اور دینِ متین کی پابندی اپنے لیے اور دیگر انسانوں کے لیے ناگزیر سمجھتے ہیں۔ ان کی زندگی دینی رنگ میں رنگی ہوئی ہے۔ وہ گفتار کے غازی نہیں بلکہ کردار کے غازی ہیں۔ ایک راسخ العقیدہ اور سلفی المسلک عالم ہیں اور علم کو اپنی ذات پر مستولی کرنے کا ہنر جانتے ہیں۔ جیسے شیخ سعدیؒ نے کہا تھا:

علم را بردل زنی یارے بود
علم را بر تنِ زنی مارے بود

ہمیں یقین ہے کہ ابوالبیان ظہور احمد فاتح کا یہ اسلوب شعر جو اسلامی خدوخال کا حامل ہے، نئی نسل کے لیے مشعلِ راہ ثابت ہوگا اور ان کے قارئین کرام ان کی اسلامی فکر سے اپنے دل و دماغ کو اجالتے چلے جائیں گے۔

ابوالبیان ظہور احمد فاتح کے ملی احساسات

ملت کیا ہے؟ کسی قوم کے کوائفِ دینی کا نام ہے۔ یہ وسیع تر تناظر میں قومی آہنگ کی بھی نمائندگی کرتی ہے۔اقبال نے بجا کہا تھا:

افراد کے ہاتھوں میں ہے اقوام کی تقدیر
ہر فرد ہے ملت کے مقدر کا ستارہ

ابوالبیان ظہور احمد فاتح کے ہاں بھی ملی فکر قومی شعور کے ساتھ پائی جاتی ہے۔ان کے شعری مجموعوں کے مطالعہ و تجزیہ سے یہ امر مترشح ہوتا ہے کہ ملی جذبہ ان کے سخن کی جان ہے۔ یہ بجا ہے کہ ان کے ہاں موضوعات کا بے پایاں تنوع پایا جاتا ہے لیکن وہ کہیں بھی اس عظیم احساس سے غافل دکھائی نہیں دیتے جس سے ان کے نقادانِ فن کی نفی ہو جاتی ہے۔جن کا دعویٰ ہے کہ ظہور احمد فاتح ادب برائے ادب کے قائل ہیں۔ان کا بامقصد کلام اس بات پر روشنی ڈالنے کے لیے دال و مشیر ہے کہ وہ ادب برائے زندگی سے بھی بیگانہ نہیں ہیں۔ان کے ہاں صرف رومان یا احساسِ جمال ہی کارفرما نہیں، وہ فکرِ ملت اور جذبۂ حب الوطنی سے بھی سرشار ہیں۔ کیوں نہ ہو کہ جنابِ فاتح ذاتی طور پر راسخ العقیدہ مسلمان ہیں جو گفتار کے غازی نہیں بلکہ کردار کے بھی ہیں۔جن کے دل میں دردِ ملت بھی ہے اور حزنِ زوال بھی ہے۔وہ سنگینیٔ حالات کے باعث یاس بداماں نہیں ہوتے بلکہ رجائیت کا دامن ہاتھ سے نہیں جانے دیتے۔ان کے دل میں جہاں ارتقائے قوم کا جذبہ ہے، وہاں ملی نشاۃِ ثانیہ کے ارمان بھی ہیں۔خصوصاً ان کی ابتدائی شاعری

میں ملی احساسات کی کیفیات زیادہ پائی جاتی ہیں۔

ملی جذبات کا نقطہء پرکار ذاتِ خداوندی اور حبِ رسالت مآب ﷺ ہوا کرتا ہے۔ان کے ہاں حمد ثنائے ربِ ذوالجلال کس وفور سے ہے کہ ان کی ایک پوری کتاب ''روح ترے مراقبے میں ہے'' مطبوعہ 2006ء مکمل طور پر حمدیہ کلام پر مشتمل ہے۔ہنوز ثنائی شاعری پر ان کی ایک اور کتاب بھی ترتیب پا سکتی ہے۔اسی طرح ذاتِ رسالت مآب ﷺ کی نسبت سے عقیدت گزاریاں بھی بڑے پیمانے پر پائی جاتی ہیں جن میں سے ایک نعتیہ مجموعہ ''سلام کہتے ہیں'' مطبوعہ 2007ء کے نام سے منظرِ عام پر آ چکا ہے۔علاوہ ازیں نعتیہ کلام پر مشتمل ان کی ایک مزید کتاب بھی مدون ہوسکتی ہے۔ان دونوں موضوعات پر قبل ازیں مقالات کتابِ ہٰذا کا حصہ ہیں۔یہاں ہم ان مزید ملی جذبات کے حوالے سے رقم طراز ہیں جو ان کی متذکرہ کتب کے علاوہ ہیں۔کم و بیش 1973ء میں انٹرمیڈیٹ کے امتحان کے بعد با امرِ مجبوری و معذوری تعلیمی سلسلہ منقطع ہوجانے کے بعد انہوں نے پانچ کتابوں پر مشتمل ایک مجموعہ کلام ''اقلیمِ سخن'' کے نام سے مرتب کیا تھا جس میں مشمولہ کتب کے نام حسبِ ذیل ہیں:

1۔آئینہء دل

2۔تصویرِ کائنات

3۔چہرہء ہستی

4۔متاعِ احساس

5۔نقدِ شعور

اول الذکر تین کتب بالترتیب 1980ء، 2013ء، 2014ء میں شائع ہوئیں جبکہ موخر الذکر دو کتب کی اشاعت کی نوبت ہنوز نہیں آئی۔تاہم جلد ہی انہیں منظرِ عام پر لانے کا ارادہ رکھتے ہیں۔ان پانچوں کتب میں ملی شاعری بامِ عروج پر نظر آتی ہے۔

ذیل میں ہم ابوالبیان ظہور احمد فاتح کے شائع شدہ کلام میں سے ملی شاعری کے امکانات کے حوالے سے تحریر پرداز ہیں جو ان کے غیر مطبوعہ کلام کا عشرِ عشیر بھی نہیں ہے۔

اس وقت بلحاظِ اشاعت ابوالبیان ظہور احمد فاتح کا پانچواں شعری مجموعہ ''سنہرے خواب مت دیکھو'' مطبوعہ دسمبر 2004ء ہمارے روبرو ہے جس کی ایک نظم ''صدائے کشمیر'' ملی احساسات سے مملو محسوس ہوتی ہے۔چند اشعار ملاحظہ ہوں:

آج پھر وادیء، کشمیر صدا دیتی ہے
جس کی رودادِ الم عرش ہلا دیتی ہے
وادیء خلد نشاں میں ہیں مظالم برپا
اہلِ کشمیر سے چھینا گیا حق جینے کا
آہ وہ جبر و تشدد کے بھیانک منظر
اُف وہ بارود کی بدبو کہ ہے جینا دوبھر
ہائے وہ بے بس مجبور بناتِ وادی
وہ درندے وہ ہوس ناکی وعصمت ریزی
کہیں ماتم کہیں نوحے کہیں غمگین جلوس
وہ شہیدوں کے جنازے وہ لہورنگ عروس
سب کا آہنگ ہے آزاد وطن ہو اب کے
سر ہتھیلی پہ ہو اور سر پہ کفن ہو اب کے
تم سپاہی ہو شب و روز برابر کر دو
مال و جاں مادرِ گیتی پہ نچھاور کر دو
غازیو! جبر یہ مجبور یقیناً ہو گا
کفر کشمیر سے مفرور یقیناً ہو گا

(''سنہرے خواب مت دیکھو''۔نظم: صدائے کشمیر۔صفحہ 56 تا59)

آپ نے دیکھا ایک ایک شعر کس طرح ملی کرب وسوز کا مظہر ہے۔حالات کی منظرکشی ملی تناظر میں کس پر درد انداز میں کی گئی ہے۔تاہم وہ ناامید نہیں ہوتے بلکہ رجائیت کا عالم تادمِ آخر برقرار رہتا ہے۔

رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم جو جانِ کائنات ہیں، وجہِ تخلیقات ہیں، ان سے عقیدت گزاریاں بصورتِ نعت یوں بھی کثرت سے ہوئی ہیں تاہم ولادتِ پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے حوالے سے ان کی ایک نظم کے حسبِ ذیل اشعار کتنے ایمان افروز ہیں:

واسطے جن کے زمین و آسماں پیدا ہوئے
شہرِ مکہ میں وہ حق کے پاسباں پیدا ہوئے

وہ رسالت کے امیں وہ تاجدارِ کائنات
والیٔ کونین فخرِ دو جہاں پیدا ہوئے
وہ حبیبِ کبریاؐ وہ محسنِ خلقِ خدا
شافعِ محشر، شفیعِ عاصیاں پیدا ہوئے
صد مبارک باد مظلومو ضعیفو بے کسو
آج دنیا میں قوامِ بے کساں پیدا ہوئے
بھیجیے ان کی مقدس ذات پر لاکھوں درود
بن کے تسکینِ دل و آرامِ جاں پیدا ہوئے

(''تصویرِ کائنات''۔صفحہ 28-29)

کتنی عقیدت و محبت اور دینی سرشاری کا اظہار نظم ھٰذا سے ہو رہا ہے۔ ایک طرف نبی ختمی مرتبت ﷺ کے اوصافِ حمیدہ گنوائے جا رہے ہیں، دوسری طرف طبقاتِ عالم کو ہدیۂ تبریک پیش کر کے سکون اور فلاحِ دارین کی کیفیت کا ذکر کیا جا رہا ہے۔ یقیناً ایک مردِ مومن ہی افراط و تفریط سے بچتے ہوئے نعت نگاری اور عقیدت گزاری کے قرینے پورے کر سکتا ہے۔

ملی شاعری کے حوالے سے پروفیسر ظہور احمد فاتح کی ایک اور پر فکر نظم ''تجدیدِ عہد'' ہے جس میں تاکیدی پہلو نمایاں طور پر پایا جاتا ہے۔ لیجیے، نظم کے اشعار کا مطالعہ کرتے ہیں:

جس کی غفلت سے بھلا رکھا ہے اب تک ہم نے
دوستو آؤ پھر سے اس عہد کی تجدید کریں
جس کی تنویر سے روشن ہیں قرونِ اولیٰ
آؤ اس دور کے اس باب کی تمہید کریں
دل کو ایمان کے مصباح کی تابانی دیں
حسنِ اعمال سے خود کو دلِ خورشید کریں
ہر قدم کے لیے قرآن سے ہدایت چاہیں
ہر گھڑی سنتِ یٰسین کی تقلید کریں
ہے اسی میں ہی بھلائی کہ دل و جان سے ہم

اپنے اللہ کے ہر حکم کی تائید کریں
صرف کافی نہیں اپنا ہی مسلماں ہونا
بلکہ دنیا کو بھی ہم قائلِ توحید کریں
کفر سے شرک سے بیداد سے لازم ہے جہاد
اور بدکاری و گمراہی کی تردید کریں

(''تصویرِ کائنات''۔صفحہ 53-54)

شاعر نے بڑی دل سوزی سے اہلِ قوم کو پھر سے دین سے کامل وابستگی کی تلقین کی ہے۔ عالمِ ارواح میں اور پھر عالمِ شعور میں ہم نے اپنے آقا و مولا سے جو عہد استوار کیا تھا، اس میں تجدید کی ضرورت ہے۔ ہمیں غفلتوں سے باز آنا ہوگا۔ عقائد کو درست و توانا کرنا ہوگا۔ اسلامی اخلاقیات و فرائض پر مکمل طور پر عمل پیرا ہونا ہوگا۔ بطورِ خاص خود میں مجاہدانہ اوصاف پیدا کرنا ہوں گے نیز قرآن و سنت کی پیروی کرنا ہوگی۔ اس طرح ہم قرونِ اولیٰ کے مسلمانوں کی طرح فرخندہ بخت اور نیک نام ہو سکتے ہیں۔

''نسخہ'' کے عنوان سے ان کی ایک اور نظم بھی ملی شاعری میں نمایاں مقام رکھتی ہے۔ جیسے ڈاکٹر مریض کے لیے اس کی بیماری کے حسبِ حال نسخہ تجویز کرتا ہے، اسی طرح ایک شاعر بھی چارہ گر نباض کی طرح امتِ بیمار کے لیے ایک نسخہ قلم بند کر رہا ہے جس میں اس کے روحانی روگ کا علاج معالجہ تجویز کیا گیا ہے۔ نظم ملاحظہ ہو:

آ کہ میں تجھ کو بتاؤں ایک نسخہ سود مند
آزما کر جس کو ہو جائے ترا رتبہ بلند
اپنی یا لوگوں کی مرضی پر نہ چل پہلے یہ سوچ
کون سا انداز ہے اللہ کو ہے جو پسند؟
بات جو تو حق سمجھتا ہے علی الاعلان کہہ
موت کا ڈر تیرے دل میں ہو نہ خوفِ قید و بند
تیرے پائے استقلال میں نہ ہو لغزش ذرا
ہوں اگر مدِ مقابل تیرے تجھ سے بست چند
یہ نہ دیکھا کر جہاں والے تجھے کہتے ہیں کیا

گمرہوں کو ہر گھڑی کرتا رہا کر وعظ و پند
غم نہ کر پروا نہ کر تجھ پر اگر ہے خندہ زن
زہر کو جو ناسمجھ دنیا سمجھ لیتی ہے قند

("تصویرِ کائنات"۔صفحہ 55)

اس شاندار نسخے کے اجزائے ترکیبی حسبِ ذیل ہیں۔

1۔ رضائے الٰہی کے حصول کی کوشش اور لوگوں کی ملامت سے بے نیازی۔

2۔ حق کے لیے جانبازی اور بے باکی۔

3۔ اگر تیرے دشمن تجھ سے بیس گنا بھی ہوں تب بھی کثرتِ تعداد سے مرعوب نہیں ہونا بلکہ قوتِ ایمانی کے بل بوتے پر آگے ہی بڑھنا ہے۔

4۔ تیرے دل میں وعظ ونصیحت کا ایسا ذوق وشوق ہونا چاہیے کہ تو لوگوں کو بلاخوف حق بات کی تلقین کرتا رہے اور منکرات سے منع کرتا رہے۔

5۔ تجھے فراستِ دنیا پر مائل ہونے کی بجائے دانشِ دین پر کاربند ہونا چاہیے کیونکہ اہلِ جہاں تو زہر کو بھی تریاق سمجھ لیتے ہیں اور الہامِ ربانی کو دین کا یقین کرنے والا ہر خطا سے مبرا ہے۔

یہ پانچ نکاتی فارمولا فلاحِ دارین کا ضامن ہے۔ اس سے منشورِ جہاں بانی کا تعین ہوتا ہے۔ یہ خدائی ضوابط دستورِ جہانگیری کی اساس ہیں۔لہٰذا قوم کے لیے ان کی آموزش بے حد ضروری ہے۔
یہ محض نظری گفتگو نہیں بلکہ ایک باعمل اور صاحبِ کردار انسان کی ریاضتوں کا نچوڑ ہے۔ یہ اس کے تجربات ومشاہداتِ زیست کا حاصل ہے جس نے پوری زندگی دینی تقاضوں کے مطابق بسر کی ہے اور اسلامی اقدار کا مبلغ بنا رہا ہے۔

ایک شاعرِ احساس جہاں نباضِ قوم ہوتا ہے، وہاں عکاسِ حالات بھی ہوتا ہے۔ وہ نہ صرف اپنی قوم کی مدح وستائش کرتا ہے بلکہ ضرورت پڑنے پر اسے آئینہ بھی دکھایا کرتا ہے۔جس سے اس کے انتقادی شعور کی عکاسی ہوتی ہے۔

ملی شاعری میں ایک انداز علامتی، مزاحمتی اور طنزیہ بھی ہوتا ہے جیسے اکبرالہ آبادی کا اسلوبِ نگارش تھا۔ ابوالبیان ظہور احمد فاتح کی زیرِ نظر نظم بعنوان "مقامِ افسوس" اسی کیفیت کی حامل ہے۔ذیل میں اس کے اشعار تحریر کیے جاتے ہیں:

اے مسلماں اب مسلمانی پہ تو اتنا نہ بھول
آہ تو نے توڑ ڈالے دینِ حق کے سب اصول
اب کہاں کرتا ہے تو تعمیلِ احکامِ خدا؟
اب کہاں ہے تیرے دل میں جلوہ گر حبِ رسولؐ؟
اب کہاں ہے تجھ میں وہ پابندیٔ صوم و صلوٰۃ؟
اب کہاں ہے خدمت و خیرات میں تیرا شمول؟
اب کہاں ہے تیرے دل میں موجزن شوقِ جہاد؟
راہِ حق میں جان دینا اب کہاں تجھ کو قبول؟
اب کہاں حق حاکمِ ظالم سے کہہ سکتا ہے تُو؟
اب کہاں ہے تیرے دل میں جذبۂ ابنِ بتول؟
اب کہاں وہ عادتِ ایجاد و تعمیرِ جہاں؟
آب کہاں وہ علم وعرفاں کے لیے شوقِ حصول؟
آج تیرے کارنامے قابلِ نفرین ہیں
آج تیری حرکتوں پہ دنگ رہتی ہیں عقول
اپنی حالت پر نظر کر سوچ اے ناداں ذرا
اتنی جلدی داستانیں اپنے آبا کی نہ بھول
تیرا ہر اک فعل ہے جب حکمِ یزداں کے خلاف
کیسے ہو سکتا ہے تجھ پر رحمتِ رب کا نزول؟
آہ! اے گمراہ مسلم! فکر کر اصلاح کی
دیکھ تیرے حال پر دل ہے پریشان و ملول

(''تصویرِ کائنات''۔ صفحہ 57 تا 59)

شاعر دردِ دل کے ساتھ ایک ملی المیہ کی نشاندہی کر رہا ہے اور ایک ایک نکتہ سمجھانے کی کوشش کر رہا ہے۔ کبھی اسے پدرم سلطان بود والی بات سے عار دلاتا ہے، کبھی اصول شکنی پر اظہارِ تاسف کرتا ہے، کبھی خدائی احکامات کی نافرمانی پر ملامت کرتا ہے اور کبھی حبِ رسول ﷺ کے فقدان پر شاکی ہوتا ہے۔ کبھی

نماز وروزے کی عدم ادائیگی پر متنبہ کرتا ہے، کبھی خیرات وخدمت سے دوری پر ڈانٹتا ہے۔ کبھی جہاد اور شوقِ شہادت سے بیگانگی پر اظہارِ ناخوشی کرتا ہے، کبھی ظالم حکمرانوں سے امرِ حق نہ کہنے اور جذبہء حسینیت سے قاصر رہنے پر تلملاتا ہے۔ کبھی علم وعرفان سے غفلت اور اتحاد وارتقا سے محرومی پر دکھ کا اظہار کرتا ہے۔ کبھی اس کی منفی کارکردگی پر خفا ہوتا ہے اور اس کی غلط حرکات وسکنات پر ملول ہوتا ہے۔ کبھی اسے عظمتِ آباء کے حوالے سے اور ذاتی رجعتِ قہقری کی نسبت سے شرمندہ کرتا ہے۔ پایانِ نظم بڑے پرسوز طریقے سے اسے فکرِ اصلاح کی طرف متوجہ کرتا ہے اور یہ کہتا ہے کہ یہ باتیں خاکہ اڑانے کی نیت سے نہیں بلکہ پریشانیءِ خاطر کے باعث کہی گئی ہیں۔ اگرچہ موضوعِ ھذا بہت کچھ لکھنے کا متقاضی ہے، تاہم سخن ورنے ایجاز واختصار کے تقاضے نبھاتے ہوئے جذبات کی شدت کے باوصف خصوصی نکات کے حوالے سے گفتگو کی ہے تاکہ نصیحت کارگر بھی ٹھہرے اور بارِ خاطر بھی نہ ہو۔

کسی قوم کے بگاڑ میں اس کی سربرآوردہ شخصیات کا بڑا عمل دخل ہوتا ہے۔ ملتِ اسلامیہ میں علما کا کردار کلیدی اہمیت کا حامل ہوتا ہے۔ فرمانِ رسول ﷺ ہے کہ ”عالم کی برائی عالمی برائی بن جاتی ہے۔“ ہمارے علمائے سو کا بھی یہی حال ہے کہ انہوں نے ملت کو فرقہ بندی میں مبتلا کر رکھا ہے۔ بے عملی کے باعث ان کے وعظ بے اثر ہوکر رہ گئے ہیں۔ اس کیفیت کو مدنظر رکھتے ہوئے ابوالبیان ظہور احمد فاتح کو بڑے ادب سے پرسوز انداز میں چند مشورے دیے ہیں جو خاصے موثر ہیں اور ان کے گہرے ملی احساسات وواردات کے عکاس ہیں۔

اے دینِ وحدت کے پاسبانو! اے قومِ مسلم کے رہنماؤ!
اے وارث الانبیا بزرگو! اے مذہبِ حق کے پیشواؤ!
میں مانتا ہوں کہ آپ حضرات نیک بھی ہیں عظیم بھی ہیں
بزرگ بھی ہیں، حکیم بھی ہیں، فقیہہ بھی ہیں فہیم بھی ہیں
میں جانتا ہوں کہ آپ لوگوں کو اپنے مذہب سے ہے محبت
مجھے یقیں ہے کہ آپ سب چاہتے ہیں اسلام کی حکومت
مگر میں حیران ہوں کہ مابین آپ کے انتشار کیوں ہے؟
فقط فروعات کی بنا پر دلوں میں اتنا غبار کیوں ہے؟
اگر سمجھتے بھی ہیں تو فرمائیں کیسی ہے یہ ستم ظریفی؟

سنو سنو وقت کہہ رہا ہے ، سنو سنو وقت کہہ رہا ہے
کہ اہلِ اسلام کے علی الرغم خونِ اسلام بہہ رہا ہے
سنو سنو کہہ رہا ہے قرآن ایک ہو جاؤ حق پرستو
سنو کہ اللہ کا ہے فرمان ایک ہو جاؤ حق پرستو
سنو اگر آپ نے نہ چھوڑی یہ فرقہ بندی یہ کینہ سازی
نہ اس جہاں میں نہ حشر کے روز پائیں گے آپ سرفرازی
اگر ہوئے آپ سب اکٹھے تو پاؤں چومے گی کامیابی
شکست کھائے گا آپ لوگوں سے ہر دغا باز انقلابی

(''چہرہءِ ہستی''۔علمائے دین کی خدمت میں۔صفحہ 56-57)

نظمِ مرقومہ میں جنابِ فاتح نے بڑے ادب آمیز اور محبت انگیز انداز میں علمائے دین کو مخاطب کیا ہے اور گزارش کی ہے کہ آپ لوگوں کے پارسا اور ذی شان ہونے میں کوئی کلام نہیں، آپ میں کئی اوصاف پائے جاتے ہیں، وہ بزرگی ہو یا دانش مندی، تدبر ہو یا فراست،آپ میں کسی چیز کی کمی نہیں ہے۔اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ آپ دینِ متین سے گہری محبت رکھتے ہیں۔نہ اس میں کوئی شبہ ہے کہ آپ ملک میں اسلامی نظامِ حیات کا نفاذ چاہتے ہیں۔مگر میں یہ سمجھنے سے قاصر ہوں کہ آپ اس قدر انتشار میں کیوں مبتلا ہیں۔محض فروعات کی وجہ سے ایک دوسرے سے منافرت کا کیا جواز ہے؟ ہر طرف ڈیڑھ اینٹ کی مسجد الگ بنائی جاتی ہے۔آپ حضرات کو یہ سمجھ کیوں نہیں آتی کہ ناانصافی سے کمزوری پیدا ہوتی ہے اور اگر سمجھتے بوجھتے ہوئے آپ ایسا کرتے ہیں تو اس سے بڑھ کر ستم ظریفی اور کیا ہو گی۔ذرا نوشتۂ دیوار پڑھیے۔ذرا وقت کی آواز سنیے۔ہر طرف سے صدائیں آرہی ہیں کہ مسلمانوں کے ہوتے ہوئے بلکہ ان کی وجہ سے ہی اسلام کا خون ہو رہا ہے۔حالانکہ درسِ قرآن تو یہ ہے کہ حق پرستوں کو متحد رہنا چاہیے اور خدا کی رسی کو مضبوطی سے تھامنا چاہیے۔نیز فرقہ بندی سے بچنا چاہیے تو آپ کو معلوم ہونا چاہیے کہ اگر یہ روش ترک نہ کی گئی تو دنیا میں بھی زوال کا منہ دیکھنا پڑے گا اور آخرت میں بھی شرمندگی کا سامنا کرنا پڑے گا۔ہاں البتہ اگر آپ متحد و مجتمع رہے تو کامیابی آپ کے قدم چومے گی اور کسی فریبی تابوت کو آپ پر غلبہ نصیب نہیں ہوگا بلکہ ناکامی و نامرادی اس کا مقدر ٹھہرے گی اور آپ سرفراز و سرخرو ٹھہریں گے۔

یہ نظم تحلیلِ نفسی کا عمدہ نمونہ ہے۔پہلے نہایت متانت و محبت سے علما کی علوئے شان کی طرف اشارہ

کیا گیا ہے اور پھر استفہامیہ انداز میں ان کی کوتاہیوں سے انہیں عار دلائی گئی ہے۔ نیز عالمی حقائق کو سامنے رکھتے ہوئے اتفاق و اتحاد کی اہمیت و افادیت کا ذکر کیا گیا ہے۔اس پر عمل پیرا ہونے کی صورت میں کامیابی وکامرانی کی نویدِ جانفزا سنائی ہے۔ملی تناظر میں یہ نظم بہت اہمیت کی حامل ہے۔

آیئے اب ''اعتراف'' سے معنون جنابِ فاتح کی ایک اور نظم کا جائزہ لیتے ہیں جس کے اشعار کچھ یوں ہیں:

ترک کر کے خود ستائی چھوڑ کر لاف و گزاف
اس حقیقت کا ہمیں کرنا پڑے گا اعتراف
قوم ہے اس وقت سے راہِ تنزل پر رواں
ہو گیا ہے جب سے اس کا فعل ایماں کے خلاف
ہو گئی ہے آہ میری قوم پستی کا شکار
کر رہی ہے جب سے دینِ حق سے یہ انحراف
اٹھ گیا ہے جب سے اس کا اپنے مذہب سے یقیں
روز بڑھتا جا رہا ہے انتشار و اختلاف
اب خدا کا خوف باقی ہے نہ آہنگِ جہاد
اب نہ شوقِ سجدہ ریزی ہے نہ رسمِ اعتکاف
اشتیاقِ حجِ کعبہ ہے کہاں اب قوم میں؟
اب تو عیاشی کے مرکز ہیں اسے جائے طواف
امتِ مرسلؐ کو یارب پھر ہدایت سے نواز
اور اس کی غلطیاں کوتاہیاں کردے معاف

(''چہرۂ ہستی''۔صفحہ:60-61)

ابوالبیان ظہور احمد فاتح بڑے دردِ دل سے امتِ مسلمہ کو یہ مشورہ دے رہے ہیں بلکہ یہ تلقین کر رہے ہیں کہ اب دورِ عمل ہے،خودستائی اور بے جا فخر ومباہات سے کنارہ کشی کر لی جائے اور کھلے دل سے حقائق کا اعتراف کیا جائے۔ یہ مان لیا جائے کہ ہم تنزل میں مبتلا ہیں اور یہ زوال اس وقت سے جاری وساری ہے جب سے بے ایمان وعمل میں مغائرت پیدا ہوئی ہے۔جب سے ہم نے اپنے سچے دین سے گریز

پائی اور بیگانگی اختیار کی ہے، اس وقت سے ہم قعرِ مذلت میں گرتے جا رہے ہیں۔ جب سے اپنے دینِ عالی پر یقین متزلزل ہوا ہے، اس وقت سے ہماری ملی وحدت پارہ پارہ ہوگئی ہے اور شیرازہ بندی کی کوئی صورت نظر نہیں آتی۔ اب نہ دلوں میں خوفِ خدا ہے، نہ جذبہ جہاد کارفرما ہے، نہ وہ نظامِ صلوٰۃ ہے اور نہ سنتِ اعتکاف کی ادائیگی ہے۔ حد تو یہ ہے کہ اب حج کا وہ ذوق وشوق بھی باقی نہیں رہا جو دلوں میں ہلکورے لیا کرتا تھا۔ سچ تو یہ ہے کہ اب نوجوانانِ ملت عیش وعشرت کے اڈوں کی طرف زیادہ راغب ہیں۔ یہ وہ انحطاطِ کردار ہے جس کی طرف اکبر الہ آبادی نے یوں اشارہ کیا تھا:

چلے ہیں شیخ کعبہ، ہم انگلستان دیکھیں گے
وہ دیکھیں گھر خدا کا ہم خدا کی شان دیکھیں گے

پایانِ نظم شاعر دست بدعا ہے کہ مالکِ حقیقی اس قوم کو نشاۃِ ثانیہ عطا فرمائے تاکہ ہدایت سے بہرہ افروز ہو کر پھر سے یہ قوم پاک صاف ہو جائے۔ رب العزت اس کی غلطیوں اور کوتاہیوں سے صرفِ نظر کر دے۔ ایک پاکیزہ ومطہر حیات سے نوازے۔ یہاں یہ امر قابلِ توجہ ہے کہ جیسے ادائیگی فرض کے بعد دعا مانگی جاتی ہے، شاعر بھی امر بالمعروف ونہی عن المنکر کا فریضہ ادا کرنے کے بعد اللہ تعالیٰ کے حضور محوِ دعا و مناجات ہے کہ وہ امتِ مسلمہ کی مغفرت فرمائے جیسے گہری ریاضت کے بعد نزولِ نور کا انتظار ہوتا ہے۔

ابو البیان ظہور احمد فاتح متین اور منجھے ہوئے سخن ور ہیں۔ وہ اس امر سے خوب واقف ہیں کہ کلام موثر کے کیا تقاضے ہیں۔ بھرپور ابلاغ کیسے ہوتا ہے۔ پند ومواعظ کے کیا قرینے ہیں۔ بیانِ دل نشیں کا کیا سلیقہ ہے۔ وہ ایک مخلص انسان ہیں۔ محبِ قوم ووطن ہیں۔ دین سے گہرا شغف رکھتے ہیں۔ زوالِ امت ان کے لیے سوہانِ روح ہے۔ جس کی چارہ سازی کے وہ دل کی گہرائی سے خواہاں ہیں۔ ان کے افکار میں خالص دینی ریاضت کا رنگ غالب ہے۔ وہ صدقِ دل سے نصیحت کرتے ہیں۔ ان کی موعظت عالمِ باعمل کی نصیحت سے کم نہیں۔ امیدِ واثق ہے کہ ان کے کلام سے امتِ مسلمہ منفعت پذیر ہوگی اور فکرِ ملی ثمر آور ثابت ہوگی۔

ابوالبیان ظہور احمد فاتح اور ان کی قومی شاعری

علامہ اقبال نے فرمایا تھا:

افراد کے ہاتھوں میں ہے اقوام کی تقدیر
ہر فرد ہے ملت کے مقدر کا ستارہ

شعرِ ھذا کے بمصداق یوں تو ہر شخص قومی تشخیص کا آئینہ دار ہے لیکن قومی فکر رکھنے والے لوگ فی الواقعہ حاملِ عظمت ہیں۔علامہ اقبال نے ہی کہا تھا:

ہزاروں سال نرگس اپنی بے نوری پہ روتی ہے
بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا

اگر ہم یہ کہیں کہ ابوالبیان ظہور احمد فاتح نرگسِ گریاں کے دیدہ ورِ مطلوب ہیں تو بے جا نہ ہوگا کیونکہ حقیقتاً قومی و ملی فکر کے حامل ہیں۔ان کے کلام کا بہت بڑا حصہ قومی شاعری پر مشتمل ہے۔قومی شاعری کیا ہے، دراصل ایسا سخن ہے جو فکرِ قوم اور تدبیرِ کارواں کا حوالہ ہو۔ایسا کلام ہے جو زوالِ قوم پر اظہارِ تاسف اور تعمیرِ ملت کی طرف مشیر ہو۔ایسا بیان ہے جو امت کی شیرازہ بندی اور ناقہء بے زمام کی سوئے قطار واپسی کا ذمہ دار ہو۔ایسی نوائے دل سوز ہے جو دردِ قوم میں ڈوبی ہوئی ہو۔ایسا کربِ روح گداز ہو جس سے المِ زیاں کا اندازہ ہوتا ہو۔دراصل قومی شاعری ایسی چارہ سازی ہے جو امراضِ قوم کے تشخیص و علاج سے متضمن ہو۔ایسی غواضی ہے جس میں ارتقائے قوم کے لیے لعل و جواہر مجتمع ہو رہے ہوں۔المختصر یہ قصیدہ

ہے عظمتِ رفتگاں کا، یہ داد ہے کرشمہ ہائے ناموراں کی، یہ کہانی ہے عظمتِ رفتہ کی، یہ واردات ہے کربِ دل کی، یہ ملامت ہے سہل انگاری پر، یہ زہر خند ہے سفلگی اور مردنی پر، یہ رزمیہ ہے مجاہدینِ قوم کا، یہ حزنیہ ہے غفلتِ نسلِ نو کا، یہ المیہ ہے عیش وعشرت کا، یہ آہنگ ہے بیداری کا، یہ امنگ ہے انقلاب کی، یہ نوید ہے فردائے دل نوازکی، یہ مژدہ ہے قربِ منزل کا اور انہی تمام اوصاف کا حامل کلامِ ابوالبیان ظہور احمد فاتح ہے۔

اس وقت ''وقت کی آواز'' سے معنون ایک نظم ہمارے سامنے ہے جوان کے مجموعہءِ کلام ''آئینہءِ دل'' مطبوعہ 1980ء میں شامل ہے، اس نظم میں مسلمان قوم کو مخاطب کیا گیا ہے اور متنبہانہ انداز میں خوابِ غفلت سے بیدار کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔لہٰذا مسلمانانِ پاکستان کے لیے بھی پاکستانی قوم کی حیثیت سے وہی ترغیب وتحریص پائی جاتی ہے، جو من الحیث المجموع امت مسلمہ کے لیے ہے۔اس میں احساسات کی شدت اور حب القوم کا عنصر بھرپور انداز میں کارفرما ہے۔نظم ملاحظہ کیجئے:

اے مسلماں خوابِ غفلت سے ذرا بیدار ہو
وقت نازک تر ہے جلدی اٹھ سنبھل ہشیار ہو
اے گرفتارِ مصائب وقت کی للکار سن
ذرہ ذرہءِ جہاں سے اپنا حالِ زار سن
تو تھا خورشیدِ زمانہ آفتابِ ضوفشاں
تیری ہستی آج ذرہ سے بھی کم تر الاماں
تو کہ تھا شمعِ ہدایت آج ہے بھٹکا ہوا
تجھ سے ڈرتے تھے سبھی اب خود تجھے کھٹکا ہوا
مشتعل تھی تیری ہمت خوب تھے تیرے نصیب
ڈوبنے والا ہے اب تو دیکھ ساحل کے قریب
لمحہ لمحہ قیمتی ہے جلد اے ناداں سنبھل
زورِ بازو کام میں لا اور طوفاں سے نکل
فتح ونصرت کے لیے رب سے طلب امداد کر
غفلتوں سے باز آ جا عہد اپنا یاد کر

اٹھ کھڑا ہو اپنے وعدے کو نبھانے کے لیے
ملک میں اسلام کا آئین لانے کے لیے
دہر کو اسلام کا نقشہ دکھانے کے لیے
سکہ طاقت کا زمانے پر بٹھانے کے لیے
بے کس و مسکین کی ڈھارس بندھانے کے لیے
دشمنانِ دینِ احمد کو مٹانے کے لیے

(''آئینۂ دل''۔صفحہ 16-17)

وہ اپنی قوم سے مخاطب ہیں کہ وہ خوابِ غفلت میں مبتلا ہے۔ضرورت اس امر کی ہے کہ بیداری اختیار کرے۔وقت کی نزاکت کو سمجھے اور اٹھ کھڑی ہو۔یہ بجا کہ تو مصائب میں گرفتار ہے لیکن تجھے وقت کی للکار سننی چاہیے اور نوشتۂ دیوار پڑھنا چاہیے کیونکہ ذرہ ذرہ اس کے حالِ زار کی گواہی دے رہا ہے۔وہ بھی زمانہ تھا کہ جب یہ قوم خورشیدِ ضوفشاں کا درجہ رکھتی تھی اور اس سے زمانے روشن تھے لیکن آج زبوں حالی کا یہ عالم ہے کہ ذرۂ ریت سے بھی کم تر ہے۔تو شمعِ ہدایت کا درجہ رکھتا تھا۔جس سے لوگ رہنمائی لیتے تھے لیکن آج یہ حال ہوا ہے کہ تیری اپنی گمراہی کے امکانات پیدا ہو گئے ہیں۔یا وہ وقت تھا کہ دنیا تیری ہیبت سے خوفزدہ تھی اور یہ وقت کہ تو خود خوفزدہ اور سہا ہوا ہے۔کل تو بہت اولوالعزم اور باہمت تھا اور تیرا آفتابِ مقدر اوج پر تھا جبکہ آج تو خود ڈوبنے کے قریب ہے اور ستم یہ ہے کہ تیری غرقابی قریبِ ساحل ہوا چاہتی ہے۔لہٰذا ضرورت اس امر کی ہے کہ وقت کی نزاکت کا احساس کرتے ہوئے طوفانِ تنزل سے نکل آنا چاہیے۔تجھے چاہیے کہ تو اپنے مالکِ حقیقی سے تعلق استوار کر کے غفلتیں ترک کر دینی چاہئیں۔اور اپنا وعدہ یاد کرنا چاہیے۔وہ وعدہ جو تو نے کلمۂ شہادت پڑھتے وقت کیا تھا یا وہ عہد جو عالمِ ارواح میں وقوع پذیر ہوا تھا۔اے مسلمان! اپنا وعدہ نبھانے کے لیے کھڑا ہو جا۔اہلِ دنیا کو عظمتِ اسلام کا نقشہ پھر سے دکھا دے۔طاقت ور بن کر اپنی قوت کا سکہ اہلِ جہاں پر بٹھا دے۔جو لوگ بے کس ہیں، ان کی ڈھارس بندھا، ان کا سہارا بن جا اور وہ لوگ جو اسلام اور عالمِ اسلام کی دشمنی پر کمربستہ ہیں، انہیں نیست و نابود کر دے۔

یہ انقلاب آفریں نظم ہے۔قومِ خوابیدہ کو جگانے کے لیے نوائے قُم باذن اللہ ہے۔غفلتوں پر ملامت ہے۔وقت کی اہمیت اور عصری تقاضوں کو سمجھنے کی تنبیہہ ہے اور تجدیدِ عہد کا آہنگ ہے۔مشاہیر کی

روایات کو زندہ کرتے ہوئے اسلام کی نشاۃِ ثانیہ کی فکر اور دشمنانِ اسلام کی سرکوبی کا مشورہ ہے۔

شاعرِ احساس جب قوم کو مائل بہ انحطاط دیکھتا ہے تو اس کے دل پر چوٹ پڑتی ہے اور جب یہ زوال وجہِ سکوت ٹھہرتا ہے تو وہ خون کے آنسو روتا ہے بلکہ اسی کیفیت کی غماز ابوالبیان ظہور احمد فاتح کی نظم ''خون کے آنسو'' جوان کے مجموعۂ کلام ''آئینۂ دل'' کا حصہ ہے، یہ وہ تاریخی نظم ہے جو سقوطِ ڈھاکہ کے موقع پر لکھی گئی تھی۔ ان دنوں وہ انٹرمیڈیٹ کے طالب علم تھے۔ اپنے کالج کی ایک تقریب میں جب انہوں نے یہ نظم سنائی، تو اخبار والوں نے یہ سرخی لگائی کہ جنابِ فاتح روتے ہوئے آئے اور سب کو رلا کر چلے گئے۔ نظم ہدیۂ قارئین ہے:

دل تڑپ اُٹھتا ہے ہے مسلم دیکھ کر حالت تری
خون کے آنسو رلاتی ہے مجھے غفلت تری
آہ ناداں کھول آنکھیں اور اپنا حال دیکھ
دیکھ کیسے مل رہی ہے خاک میں عظمت تری
درد ہوتا ہے جگر میں اور پھٹتا ہے دماغ
دیکھ کر بدحالی و رسوائی و ذلت تری
تیری بربادی کا باعث ہیں تری بدکاریاں
تیری گمراہی کے باعث ہے یہ کیفیت تری
جس قدر تو اپنے دیں سے منحرف ہوتا گیا
اس قدر گھٹتی گئی ہے عزت و قوت تری
تو نے اوروں کے سہارے پر بھروسہ کر لیا
تیری کم فہمی کے باعث آ گئی شامت تری
تو ہوا کرتا تھا ہر دم دوسروں کا آسرا
آج تجھ کو کیا ہوا ہے کیا ہوئی غیرت تیری
زندہ رہنا ہے تو شمشیر و سناں کی مشق کر
موت کا پیغام ہو گی مستی و عشرت تری
تیری ناکامی و رسوائی ہے عیاشی کا پھل

یاد رکھ جدو جہد میں ہے نہاں عزت تری
اے مسلماں اب خدارا چھوڑ بد اعمالیاں
نیک اعمالی میں پوشیدہ ہے عافیت تری
ضامنِ رفعت ہے اسلامی نظامِ زندگی
دور ہوسکتی ہے اس ہی سے فقط عسرت تری
اے کہ سرگرمِ عمل ہو زندہ قوموں کی طرح
سخت کوشی اور سرگرمی میں ہے طاقت تری
محنت و کوشش کو تو ہر دم بنا اپنا شعار
دیکھنا کیسے چمک اٹھتی ہے پھر قسمت تری؟

(صفحہ:39 تا41)

یہ نظم ایک نفسیاتی اور واقعاتی تناظر رکھتی ہے۔شاعر کے خیال میں تمام تر پریشانیوں کا باعث قوم کی سہل انگاری،عیش پسندی اور عشرت کوشی ہے۔اخلاقی پستی اور سماجی تنزل میں بھی یہی عناصر اہم کردار ادا کرتے ہیں۔انہی کی وجہ سے ادارے مائل بہ زوال ہوتے ہیں۔ناکامی کی اور وجہ خود انحصاری کی بجائے اغیار پر بھروسہ ہے۔جنگ 1971ء میں بھی یہی اجزا اسبابِ ہزیمت کا حصہ ہیں۔خبریں اڑتی رہیں کہ امریکہ کا ساتواں بحری بیڑہ پاکستان کی مدد کو آرہا ہے۔کبھی خبر آتی کہ چین حرکت میں آیا چاہتا ہے۔لیکن ایسا کچھ بھی نہ ہوا۔بھارت کی عسکری مداخلت کے باعث سقوطِ ڈھاکہ کا دردناک باب رقم ہوا اور پاکستان کا مشرقی بازو ہمیشہ کے لیے الگ ہوگیا۔نوے ہزار پاکستانی افواج اور جنرل نیازی کو ہندو جرنیل مسٹر اروڑا کے سامنے ہتھیار پھینکنا پڑے اور جنگی قیدی کا جوا گلے میں ڈالنا پڑا۔ان اذیت ناک واقعات نے واقعتاً خون کے آنسو رلا دیے لیکن پایانِ نظم انہوں نے قوم کو یہ سبق بھی دیا ہے کہ بقا کی جنگ کے لیے اسے سخت کوشی اور مسلسل جدوجہد کا انداز اپنانا ہوگا۔تیرو سناں کی مشق کرنا ہوگی اور خود کو آہنی اعصاب کا مالک بنانا ہوگا۔تب کہیں میدانِ ظفریابی میں واپسی ممکن ہے۔اس نظم کو ہم روز افزوں زوال میں مبتلا قوم کا ایک المناک نوحہ قرار دے سکتے ہیں۔جس میں بلا کا سوز وگداز ہے۔زبردست جذباتی فضا ہے۔ساتھ ہی ساتھ ایک تاریخی تجزیہ بھی ہے۔درسِ عزیمت بھی ہے۔گویا ایک اذیت کا رونا نہیں، بلکہ ساتھ ہی ساتھ درد کی دوا بھی تجویز کی گئی ہے۔یہ نظم ایک تحریکِ انقلاب کا درجہ رکھتی ہے۔اسے ہم خفتگانِ غفلت

کے لیے تازیانۂ عبرت قرار دے سکتے ہیں۔

شاعر جس طرف بھی نگاہ دوڑاتا ہے، اسے پریشان کن مناظر دکھائی دیتے ہیں۔قوم بڑی تیزی سے قعرِ پستی کی طرف جا رہی ہے۔صرف معاشرتی زوال نہیں، بلکہ اخلاقی انحطاط بھی گھن کی طرح کھائے جا رہا ہے۔قحط الرجال کی کیفیت ہے۔سماجی خبائث ہوتے جا رہے ہیں۔خوبیوں کا فقدان ہوتا جا رہا ہے۔ اتحاد و یک جہتی کا بحران ہے۔دریا دلی عنقا ہے۔اغیار پر تکیہ لگائے ہوئے ہیں۔ذرا یہ نظم ملاحظہ ہو:

کہنے کو تو دنیا میں ہے موجود مسلماں
لیکن نہیں موجود مسلمان کے اوصاف
اب قوم میں باقی نہیں وہ جذبۂ ایمان
موجود ہے اب اس میں نہ وہ قوتِ اسلاف
اب اس میں ہیں وہ مردِ مجاہد نہ قلندر
اب اس میں نہ وہ متقی و صوفی و احناف
اب اس میں رذیلوں کی لٹیروں کی ہے کثرت
کم یاب ہیں اس قوم میں اب محسن و اشراف
اب چھائی ہے اس دل پہ گناہوں کی سیاہی
جو نور سے ایمان کے تھا روشن و شفاف
ناپید ہے اب قوم میں یک جہتی و الفت
اب اس میں دیانت ہے نہ اخلاق و انصاف
متروک ہے اس قوم میں اب خوئے سخاوت
یا بخل ہے اب طرزِ عمل اس کا یا اسراف
ہلتی ہیں اسی وقت سے ملت کی اساسیں
جس وقت سے دل گردِ کدورت سے نہیں صاف
اس قوم کی اب دوسری قوموں پہ نظر ہے
یہ ایک زمانے میں تھی خود قبلۂ اطراف

(”آئینۂ دل“۔نظم: قوم کا نوحہ۔صفحہ 44-45)

اس میں کوئی شک نہیں کہ نام کے مسلمان تو پائے جاتے ہیں مگر کام کے مسلمان آج نہیں ملتے۔وہ جذبہء ایمان اور سطوتِ اسلاف جو امتِ مسلمہ کا خاصا تھا، آج مفقود ہے۔اس قوم میں نہ وہ مجاہدینِ ذیشان اور نہ ہی اصفیائے ذی قدر ہیں۔افسوس صد افسوس کہ قوم میں رذیل اور لٹیرے فروغ پا رہے ہیں لیکن شرفا و اہلِ احسان کی قلت ہے۔قحط الرجال کا عالم ہے۔جس دل کو نورِ ایمان سے شفاف و ضوریز ہونا چاہیے تھا، وہ ظلمتِ عصیاں سے تیرہ و تار ہوتا جا رہا ہے۔اب اتحاد و یک جہتی روبہ زوال ہے۔اخلاق و انصاف اور دیانت ناپید ہے۔سخاوت جو اس قوم کا حقیقی جوہر ہے، اب جیسے متروک ہو کر رہ گئی ہو۔جب سے دلوں میں نفرت و کینہ کارگر ہوا ہے، اسی روز سے ہماری قومی بنیادیں کھوکھلی ہو گئی ہیں۔یہ قوم جو کبھی خود مرکزی حیثیت کی مالک تھی، اب اغیار پر منحصر ہو کر رہ گئی ہے۔

اگر یہ کہا جائے کہ نظمِ ھٰذا مثالی ریاست کا مختصر مگر جامع منشور خود میں سموئے ہوئے ہے تو بے جا نہ ہوگا۔اس اعتبار سے کہ اس میں عظمتِ رفتہ کا رونا رویا گیا ہے، اس لیے اسے قومی نوحہ قرار دیا جا سکتا ہے۔یہ نظم الطاف حسین حالی کی ''مدو جزرِ اسلام'' کی تلخیص قرار دی جا سکتی ہے۔

فرمانِ رسول مقبول صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم ہے کہ ''وطن کی محبت ایمان کا حصہ ہے۔'' ابوالبیان ظہور احمد فاتح کے سخن کا جائزہ لیا جائے تو پتا چلتا ہے کہ وہ پاک سرزمین کی محبت سے سرشار ہیں۔وہ خود کو قوم کا ایک ایسا سپوت سمجھتے ہیں جو دیس کے لیے جان قربان کر دینا باعثِ سعادت سمجھتا ہے۔ان کے ہاں بہت سی ایسی نظمیات پائی جاتی ہیں جن میں گل زمینِ وطن سے شدید محبت کا اظہار ہوتا ہے۔زیرِ نظر نظم معنون بہ ''اے وطن''، مشمولہ ''آئینہء دل'' اسی نوعیت کی ایک مرصع کاوش ہے جو قطعہ بند ہئیت میں رقم کی گئی ہے:

اے وطن مجھ کو دل و جان سے پیارا تو ہے
میرا محبوب مری آنکھ کا تارا تو ہے
تو جو باقی ہے تو مجھ کو بھی بقا حاصل ہے
میری معصوم امنگوں کا سہارا تو ہے
اے وطن تجھ میں ہمیشہ ہو بہاروں کا ہجوم
ہو تری مانگ پہ براق ستاروں کا ہجوم
وطنِ پاک مری جنتِ ارضی تو ہے
ہر طرف ہے تیرے پر کیف نظاروں کا ہجوم

تیرے باشندے ہمیشہ رہیں مسرور وطن
خوش رہیں تیرے یہ دہقاں، تیرے مزدور وطن
تیرا ہر فرد مسرت کے ترانے گائے
راحتوں سے تو ہمیشہ رہے معمور وطن
اے وطن ہم تیری ناموس بچائیں گے سدا
ہم یہ پیمانِ وفا اپنا نبھائیں گے سدا
اے وطن محنت و کوشش کی حسیں افشاں
تیری زلفیں، تیری پیشانی سجائیں گے سدا
اے وطن ہم تیرے ٹکڑے نہیں ہونے دیں گے
ہم تعصب کے یہاں بیج نہ بونے دیں گے
اے وطن تیری قسم جان میں جاں ہے جب تک
ایک چپہ بھی ترا ہم نہیں کھونے دیں گے

(''آئینۂ دل''۔ صفحہ 52-53)

میرے وطن! تو مجھے جان و دل سے محبوب ہے۔ تو میری آنکھ کا تارا ہے۔ میری بقا تیری بقا میں مضمر ہے کیونکہ تو ہی میری معصوم امنگوں کا سہارا ہے۔ اے نگارِ وطن میری دعا ہے کہ تجھ میں بہاروں کے میلے رہیں۔ تیرے فرقِ ناز پر روشن ستاروں کے جھمگٹے ہوں۔ تو میری زمینی جنت ہے۔ تیرے خوب صورت نظارے چاروں طرف دعوتِ نظارہ دے رہے ہیں۔ اے شہنازِ وطن تیرے باسی سدا خوش رہیں۔ تیرے کسان اور مزدور شاد ماں رہیں۔ تیرا ہر شہری مسرور و شادکام ہو۔ تو خوشیوں اور سکون سے بھرپور رہے۔ اے پیارے دیس! یہ وعدہ رہا کہ ہم ہمیشہ تیری عزت کے محافظ رہیں گے۔ اپنا یہ بھی عزم ہے کہ جد و جہد اور کاوش کے ذریعے تجھ میں حسن و زیبائی پیدا کریں گے۔ اے ارضِ پاک! یہ بھی عزم بالجزم ہے کہ ہم تیرا شیرازہ منتشر نہیں ہونے دیں گے۔ تعصّبات، جو باعثِ انتشار ہیں، انہیں پنپنے کا موقع ہرگز نہیں دیں گے۔ اے وطنِ مالوف! ہم قسم کھاتے ہیں کہ جب تک خون کی آخری بوند باقی رہے گی، ہم تیرا ایک انچ بھی کھونے نہیں دیں گے۔

آپ نے دیکھا کہ جنابِ فاتح کتنے بڑے دیش بھگت ہیں۔ نظمِ ھٰذا کا ایک ایک شبد دیش بھگتی کے

جذبات سے معمور و منور ہے۔ وطن کو اپنی بقا کا ذریعہ سمجھتے ہیں۔ وطن کی خوشی میں ان کی خوشی ہے۔ وطن کا حسن ان کے لیے بہار آفریں ہے۔ باشندگانِ وطن ان کے لیے مکرم ہیں۔ الغرض نظمِ مذکور قومی احساسات سے سرشار ہے۔

آیئے اب قومی شاعری کا ایک اور رنگ ملاحظہ ہو اور وہ ہے ملی ترانہ۔ قومی فخر و مباہات بڑے بڑے شعرا کے ہاں مشاہدہ کیے جا سکتے ہیں۔ اپنی قوم کی رفعت و جلالت شاہنامہء اسلام کا جوہر خاص ہے۔ ابو البیان ظہور احمد فاتح بھی اپنے اس ''ملی ترانہ'' مشمولہ در ''آئینہء دل'' میں قومی احساسِ برتری کا اظہار بڑی متانت سے کرتے ہیں۔ نظم ہدیہء قارئین ہے:

ہم مسلماں ہیں، غلامانِ شہِ لولک ہیں
ہم سپاہی ہیں، قوامِ سرزمینِ پاک ہیں
ہر قدم پر فتح و نصرت ہے ہماری منتظر
ہم بحارِ کاہش و ظلمات کے پیراک ہیں
ہم شجاعت میں زبیر و حیدر و ضرار ہیں
ہم جیالے ہیں بہادر ہیں جری بے باک ہیں
خالد و طارق ہیں ابنِ قاسم و محمود ہیں
اپنی ضربوں سے بتانِ سنگ سینہ چاک ہیں
لرزہ براندام ہے ہم سے طلسمِ اہرمن
ہم جہاں میں سمِ کفر و شرک کا تریاک ہیں
اپنا عزم و حوصلہ آہن سے ہے مضبوط تر
اپنے دشمن کے عزائم سب سپردِ خاک ہیں
کانپ اٹھتی ہے ہمارے دبدبے سے رزمگاہ
اپنے عزم و زور سے ہیبت زدہ افلاک ہیں
ہم رفیقوں کے رفیق و مونس و غم خوار ہیں
عرصہء پیکار میں شیرانِ ہیبت ناک ہیں
ہم وہ شبنم ہیں گل و لالہ سے جو کرتی ہے پیار

ہم وہ شعلے ہیں جلاتے جو خس و خاشاک ہیں
ہم خدا کے خلفا ہیں ہم امینِ دہر ہیں
ہم عیارِ عدل و حق ہیں صاحبِ ادراک ہیں
ہم اٹھے ہیں لے کے انصاف و ہدایت کا نشاں
اپنے خنجر ظلم و ظالم کے لیے سفاک ہیں

(صفحہ:59-60)

ہم کہ مسلم قوم سے تعلق رکھتے ہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے غلام ہیں۔ ہمارا انداز مجاہدانہ ہے۔ ارضِ پاک کے محافظ ہیں۔ قدم قدم پر نصرت وظفریابی ہمارا انتظار کرتی ہے۔ ہم ظلمات ومحن کے سمندروں کو عبور کرنے والے ہیں۔ ہماری بہادری کا یہ عالم ہے کہ بصالتِ زبیر وحیدر وضرار کے پیروکار ہیں۔ جی دار لوگ ہیں۔ جرات منداور نڈر ہیں۔ خالد بن ولید، طارق بن زیاد، محمد بن قاسم اور محمود غزنوی ہمارے مشاہیر ہیں۔ پتھروں کے بت ہماری ضربت سے ریزہ ریزہ ہیں۔ شیطانی طلسمات ہمارے سامنے کپکپانے لگتے ہیں۔ کفر وشکر جو اہلِ عالم کے لیے زہرِ قاتل ہے، ہم اس کا مداوا ہیں۔ ہمارا عزم وحوصلہ فولاد سے زیادہ مضبوط ہے اور ہمیں یقین ہے کہ ہمارے دشمن کے ارادے خاک میں مل جائیں گے۔ ہم میں وہ رعب ودبدبہ ہے کہ جنگاہ تھر تھرا اٹھتی ہے۔ ہمارے زوراور حوصلے کے سامنے آسمان بھی ہیبت زدہ ہیں۔ اگر کوئی دوست ہوتو اس کے سچے یار وغم خوار ہیں۔ لیکن رزمگاہ میں ہم ایسے شیر بن جاتے ہین جن کی ہیبت دلوں پر چھا جاتی ہے۔ بقول اقبال:

ہو حلقہء یاراں تو بریشم کی طرح نرم
رزمِ حق و باطل ہو تو فولاد ہے مومن

اگر پھول ہمارے سامنے ہوں تو ہم شبنم بن کر پیار نچھاور کرتے ہیں اور اگر کوڑا کرکٹ ہمارے روبرو ہوتو شعلہ بن کر اسے جلا ڈالتے ہیں۔ ہم خلیفتہ اللہ فی الارض کی تفسیر ہیں۔ ہمارے دم سے معیارِ حق و عدل ہے اور ہم اصحابِ فراست ہیں۔ ہم انصاف و ہدایت کے علم بردار ہیں۔ تاہم اگر ظلم و بربریت ہمارے مقابل میں ہوتو ہماری شمشیر خون آشام ہوجایا کرتی ہے۔

یہ ایک ایسی بھرپور نظم ہے جس میں ایک مشکل قافیہ سہولت وفراوانی کے پیرائے میں استعمال ہوا ہے۔ غزل کی ہیئت میں کہی گئی یہ نظم ایک شعری وفور کی حامل ہے جس میں جذبات کا تلاطم ہے۔ آہنگ و

امنگ ہے۔فخر و مباحات ہے ۔ وصف نگاری ہے۔عزتِ قوم کا تذکرہ ہے۔تشبیہات وتلمیحات ہیں۔ استعارات وتمثیلات ہیں ۔زبان آموزی ہے۔تاریخی توارد ہے۔مواجیت وتسلسل ہے۔ایک رزمیہ کے تمام تر تلازمے جوبن پر نظر آتے ہیں۔ یہ ایک ایسا رجز ہے جس کی مثال شاذ ہی ملتی ہے۔ یہ نظم ہمارے عسکری احساسات کی ترجمانی کرتی ہے اور دشمنانِ قوم کے منہ پر ایک زبردست تمانچہ ہے۔ایسی نظم یقیناً ایک خدادا اصلاحیت کا مالک قدرتِ کامل رکھنے والا سخن ور قومی شاعر ہی کر سکتا ہے۔

محولہ بالا شعری نظائر محض بطور مشتے از خوارارے پیش کیے گئے ہیں ورنہ جنابِ فاتح کے ہاں اتنا بڑا شعری ذخیرہ قومی شاعری کا حامل ہے کہ جس کے لیے دفاتر درکار ہوں گے تاہم بطور استشہاد پیش کیے جانے والے مواد سے یہ امر نکھر کر سامنے آجاتا ہے کہ پروفیسر ظہور احمد فاتح قومی شاعر کہے جانے کا استحقاق رکھتے ہیں کیونکہ وہ ایک سچے محب الوطن، کھرے ہمدردِ قوم، ایک بھرپور خیر خواہِ ملت جو زوالِ قوم پر کڑھتے ہیں۔سقوطِ پاکستان پر خون کے آنسو بہاتے ہیں۔ ہر طرح کے انحطاط پر مضمحل ہوتے ہیں۔ عظمت کے گر سکھاتے ہیں۔غفلت پر زجر و توبیخ کرتے ہیں۔ جہاد و عزیمت کا درس دیتے ہیں۔ بہادری اور حوصلہ مندی کا سبق پڑھاتے ہیں۔قعرِ مذلت سے نکالنے کی تدبیر کرتے ہیں۔عظمتِ رفتہ کا احساس دلاتے ہیں۔قوم کی نشاۃِ ثانیہ کے آرزومند ہیں اور ملک وملت کو پھولتا پھلتا دیکھنا چاہتے ہیں۔ یہ سب یقیناً قومی شاعری کے اجزائے ترکیبی ہیں جو ابوالبیان ظہور احمد فاتح کے ہاں بافراط پائے جاتے ہیں۔

زندہ رہنا ہے تو شمشیر و سناں کی مشق کر
یاد رکھ جدو جہد میں ہے نہاں عظمت تری

ابوالبیان ظہور احمد فاتح کے ہاں نقدِ دانش وحکمت

ادب کی نسبت سے دو مکاتبِ فکر پائے جاتے ہیں۔ایک ادب برائے ادب اور دوسرا ادب برائے زندگی۔دونوں مکاتبِ فکر کے شعرائے کرام نے اپنے تخلیقی کارناموں میں اپنی اپنی پسند کے مکتبِ فکر کو فروغ بخشا ہے۔ جہاں تک ابوالبیان ظہور احمد فاتح کا تعلق ہے، کچھ ظاہر بینوں نے ان کے شعر و ادب کو ادب برائے ادب پر محمول کرنے کی سعی کی ہے لیکن ہمارا نقطہء نظر ان سے مختلف ہے۔ ہم سمجھتے ہیں کہ جنابِ فاتح کے فنی سفر میں بہت سے ایسے شواہد پائے جاتے ہیں جن سے یہ امر پایہء ثبوت کو پہنچتا ہے کہ ان کے ہاں ادب برائے زندگی زیادہ کارفرما ہے کیونکہ ان کے ہاں آزموزشِ زبان ہے جس کا مقصد طلابِ ادب کی بہتر تربیت ہے۔ان کے ہاں ابلاؔغ ہے جس کا مقصود ترسیلِ شعور ہے۔ان کے ہاں پیغام ہے جس کی منزل انقلاب کے لیے زمین ہموار کرنا ہے۔ان کے ہاں فروغِ دانش وحکمت ہے جس کا مقصد جلائے اذہان وقلوب ہے۔غرض بہت سے ایسے پہلو ہیں جو ان کے ذخیرہء کلام کا حصہ ہیں۔شذرہ ھٰذا میں ہم ان کے سخن میں وفور سے دستیاب نقدِ دانش وحکمت کی نشاندہی کرنے چلے ہیں۔

اس وقت ان کی نظم معنون بہ ''اسرارِ عظمت'' مشمولہ ''آئینہء دل'' مطبوعہ 1980ء ہے۔ہمارے زیرِ نظر یہ نظم ابلاغ کا شہکار ہے۔ یوں لگتا ہے جیسے ایک مرشد اپنے کسی مریدِ باصفا کو رازہائے عظمت سے آشنا کررہا ہوتا کہ وہ بھی ان آداب کو سیکھ کر اپنے آپ کا رکنِ رکین ثابت ہو یا پھر ایک سپہ سالار اپنے ایک ایک سپاہی کی تربیت کررہا ہو تا کہ وہ مصافِ حیات میں بہتر انداز میں پیش قدمی کرسکے یا جیسے ایک مصلحِ

قوم اپنی امتِ مسلمہ کے ایک ایک فرد کو کامیابی کے گر سکھا رہا ہوتا کہ وہ عمدہ انداز میں سفرِ زیست طے کر سکے۔ نظم ہدیۂ قارئین ہے:

کیوں جذبہ مردہ ہے ترا اس کو حیات انگیز کر؟
رہ عمر بھر گرمِ عمل آرام سے پرہیز کر
منزل سمٹ کر آئے گی خود ہی ترے قدموں میں پھر
پائے عزیمت کو عطا ایقان کا مہمیز کر
بزمِ زمانہ میں جلا اخلاق و الفت کے دیے
گلدستۂ ہستی کو حسنِ خلق سے گل ریز کر
تجھ سے نہ ہو پائیں جدا دم بھر بھی تیرے آشنا
اپنے حریمِ ذات کو تو اتنا نکہت بیز کر
تیرے ہر اک دشمن کا دل تیری طرفداری کرے
یوں عظمتِ کردار سے تو خود کو دل آویز کر
تو اس مشینی دور میں پیچھے نہ رہ جائے کہیں
رفتار تیری سست ہے اس کو بھی کچھ تیز کر
سائنس کے مطلق دور میں ابہام کچھ اچھا نہیں
فاتح کا ہے یہ مشورہ ہر بات معنی خیز کر

(صفحہ:36-37)

انسانی خواہشات کا مرکز دل ہوتا ہے اور دل کی کارکردگی کا اندازہ جذبۂ دل سے لگایا جا سکتا ہے۔ لہٰذا جذبہ زندہ ہونا چاہیے کیونکہ مردہ دلی جذبے کی موت کا ثمرہ ہوتی ہے۔ پس ہمیں ہر حال میں جذبۂ دل کو تازہ رکھنا چاہیے۔ مسلسل سرگرمِ عمل رہنا بھی جذبۂ دل کا مرہونِ منت ہے جس سے اقوام ارتقا پذیر ہوتی ہیں۔ اس کے لیے عیش و عشرت، راحت و آرام سے پرہیز کرنا ضروری ہے کیونکہ ان عوارض سے ہوتے ہوئے تگ و تازِ جہاں متاثر ہوتی ہے۔ اگر منزلِ مراد پانی ہے تو وصفِ عزیمت سے متصف ہونا پڑے گا جس کے لیے یقین بنیادی کردار ادا کرتا ہے۔ مطلوب یہ ہے کہ انسان کو کامیابی کا یقین ہونا چاہیے۔ بزمِ جہاں میں خوش اسلوبی سے رہنے کے لیے حسنِ اخلاق اور عالی کردار بہت ضروری ہے۔ اس

سلسلے میں مروت و محبت بھی ناگزیر ہے۔ ان لوازم کی بدولت انسان ہر دل عزیز اور پسندیدہ ہو جاتا ہے۔ تیری ہستی ایسی نزہت آمیز اور الفت انگیز ہو کہ تیرے دوست احباب تیرے سنگ سنگ رہیں۔ بقولِ شاعر:

حیات لے کے چلو کائنات لے کے چلو
چلو تو سارے زمانے کو ساتھ لے کے چلو

تجھ میں ایسے دل نشیں کوائف ہوں کہ سب لوگ تیرے معترف رہیں۔ تجھ میں ایسی مقناطیسیت ہو کہ تیرے مخالفین بھی تیرا دم بھرنے پر مجبور ہو جائیں۔ ان سب خواص کے ساتھ ساتھ تجھ میں تندرستی و چستی بھی ضروری ہے تاکہ تیری رفتار کم از کم اہلِ دنیا کے برابر اور زیادہ سے زیادہ ان سے تیز تر ہو تاکہ تیری پیش رفت مثالی ہو اور ترقی یافتہ اقوام کی صف میں شامل ہو سکے۔ واضح رہے کہ عہدِ حاضر سائنس کا زمانہ ہے۔ اس میں فضولیات اور ابہامات کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔ تیری ہر بات قطعی اور حتمی ہو۔ تیرے ہر سخن میں عرفان و معنی خیزی ہو تاکہ تیرا گلدستۂ حیات ہر لحاظ سے معطر و دلکش ہو۔

نظم کے سیاق و سباق سے پتا چلتا ہے کہ جنابِ فاتح اپنے سخن کو تلقینِ اخلاق و کردار، ترغیبِ فکر اور تعمیر و تربیتِ ذات و صفات کے لیے استعمال کر کے دانش و حکمت کے پھول کھلانا چاہتے ہیں۔

ایک عمدہ شاعر بامقصد حیات کا ادراک رکھتا ہے۔ وہ اپنی قوم کو دعوت و ارشاد کے ذریعے مہذب سے مہذب تر بنانے کی فکر میں ہوتا ہے۔ حسنِ موعظت کا حق ادا کرتے ہوئے تقلین و نصیحت کا کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہیں دیتا۔ ہمارے مشاہیرِ سخن ور الطاف حسین حالی، اکبر الہ آبادی اور علامہ اقبال جیسی شخصیات کی فکر آمیز شاعری کی بدولت ہماری قوم نے تحریک پائی۔ اسی طرح عربی و فارسی ادب میں بھی عظیم شعرا نے جن میں حسان بن ثابت، ابوالاعلیٰ مصری، شیخ سعدی شیرازی اور رومی و جامی نے بھی اپنے کلام کے ذریعے حکمت و دانش کے درِ گراں مایہ بہم کیے۔ اس وقت ابوالبیان ظہور احمد فاتح کی نظم ''پند نامہ'' ہمارے روبرو ہے جو ان کی کتاب ''آئینۂ دل'' کا حصہ ہے۔ جسے ہم ذیل میں درج کر رہے ہیں۔

ہوتی ہے اسی شخص کی تعظیم ہمیشہ
کرتا ہے جو انسان کی تکریم ہمیشہ
پی لیتا ہے جو شخص یہاں جامِ صبوری
ملتی ہے اسے کوثر و تسنیم ہمیشہ

ہر وقت جہاں سے غم و آلام سمیٹو
دنیا میں کرو راحتیں تقسیم ہمیشہ
تھامے رہو ہر حال میں امید کی مشعل
تا دور رہے تیرگیٔ بیم ہمیشہ
ہر فن میں کرو کسبِ مہارت میرے یارو
ہر قسم کی حاصل کرو تعلیم ہمیشہ
مطلوب ہے دنیا میں اگر چین سے رہنا
اپنائے رہو وحدت و تنظیم ہمیشہ
کرتے رہو تم تیشۂ ایمان و عمل سے
ہر مسکنِ ظلمات کی تہدیم ہمیشہ
ہو کے رہا حق غالب و مقبول جہاں میں
ڈالے گئے آتش میں براہیم ہمیشہ
اک مذہبِ اسلام ہے ناقابلِ ترمیم
ہر دین میں ہوتی رہی ترمیم ہمیشہ
کردار میں اخلاق میں جو قوم ہو یکتا
کرتا ہے زمانہ اسے تسلیم ہمیشہ
جو قوم اٹھا لیتی ہے شمشیرِ عزائم
بنتی ہے وہی وارثِ اقلیم ہمیشہ

(صفحہ:42-43)

آپ نے دیکھا کہ یہ نظم بھی ملی فکر اور قومی جذبات کی حامل ہے جس میں جگہ جگہ نصائح کے موتی، مواعظ کے پھول اور ارشادات کے کواکب برائے فکرِ عواقب رونق افروز ہیں۔ یہ ایسی متاعِ دانش ہے جس کی ہر انسان کو شدید ضرورت ہے۔ یہ وہ نقدِ شعور ہے جو ذہن و دل کی جلا کے لیے انتہائی ناگزیر ہے۔ اس نظم میں وہ تلقین کرتے ہیں کہ وہی شخص لائقِ عزت ٹھہرتا ہے جو تکریمِ انسانیت کے جوہرِ خاص سے آراستہ و پیراستہ ہوتا ہے۔ جو انسان دنیا میں جامِ صبر نوش کرتا ہے، آخرت میں اسے ساغرِ کوثر و تسنیم نصیب

ہو جاتے ہیں۔ ہمیں چاہیے کہ دنیا میں غم خواری اور ہمدردی کو اپنا شعار بنائیں اور اہلِ دنیا کے دامن کو سکون و مسرت سے بھرتے چلے جائیں۔ ہمیں چاہیے کہ شمعِ امید کبھی گل نہ ہونے دیں تا کہ یاسیت کے اندھیرے مستولی نہ ہو سکیں۔ کوئی ہنر ہو، اسے سیکھنا چاہیے۔ کوئی فن ہو اس میں دستگاہ حاصل کرنی چاہیے اور علم و آگہی سے خود کو مرصع کرنا چاہیے۔ اگر دنیا میں باوقار زندگی چاہیے تو اتحاد و تنظیم کے زریں اصولوں کو کبھی فراموش نہ کرو۔ ایمان کی روشنی اور عمل کا اجالا ہمارے شاملِ حال رہے اور اس تنویر و ضیا سے قعرِ ظلمت و تاریکی کو ڈھاتے چلے جائیں۔ یہ سچ ہے کہ یہ دنیا اہلِ حق کے لیے معرض ابتلا و آزمائش ہے لیکن یہ بھی بجا ہے کہ قدرتِ کاملہ نے ہمیشہ حق کو ہی منصور و مظفر فرمایا ہے۔ خدا کے فضل و کرم سے ہمیں وہ دینِ متین عطا ہوا ہے جو ہر لحاظ سے کامل و اکمل ہے۔ لہٰذا ہمیں اسے مضبوطی سے تھامے رہنا چاہیے ورنہ دنیا کے دیگر مذاہب و ادیان قابلِ ترمیم و اصلاح رہے ہیں کیونکہ ان میں کہیں نہ کہیں کوئی کمی و کمزوری ضرور پائی جاتی ہے جبکہ یہ دینِ عالی جسے اسلام کہتے ہیں، ہر عیب و سقم سے مبرا ہے اور انسانیت کی بہترین راہ نمائی کرتا ہے۔ اہلِ جہان اس قوم کی قیادت کو تسلیم کرتے ہیں جس کا کردار لاثانی اور اخلاق بے مثال ہو لہٰذا ہمیں بھی ان اوصاف کو اپنانا ہوگا تا کہ امامتِ اقوام کا فریضہ ادا کر سکیں۔ پس خلافتِ ارضی اسی قوم کو ودیعت ہوتی ہے جس کی شمشیرِ عزائم خارا شگاف ہوتا ہے۔

زندگی ایک مسافت ہے جو مشاہدات و مطالعات سے عبارت ہے۔ شاعرِ رنگیں نوا قوم کا دیدۂ بینا ہوتا ہے۔ یہی وصف ابوالبیان ظہور احمد فاتح کا ہے۔ چنانچہ ایک موقع پر فرماتے ہیں:

دکھا رہا ہوں میں عکس ہر ایک تجربے کا مشاہدے کا
جو میرے دل پر گزر رہی ہے بعینہ وہ بتا رہا ہوں

ان کی نظم ''سیرِ دنیا'' اسی کیفیت کی مظہر ہے جو ان کے مجموعۂ کلام ''تصویرِ کائنات'' کا حصہ ہے۔ ملاحظہ کیجیے:

مثالِ تیرہ شبی دلِ ہر بشر کو میں نے سیاہ پایا
کسی کو ناآشنائے منزل کسی کو گم کردہ راہ پایا
نہیں کسی کو غمِ قیامت، نہ اپنے عصیاں پہ کچھ ندامت
جسے بھی میں نے جہاں میں دیکھا اسی کو محوِ گناہ پایا
ہے بے حیائی کا دور دورہ نہیں خدا کا کسی کو کھٹکا

کہاں کا ایمان کیسی غیرت، متاعِ دیں کو تباہ پایا
بہر طرف ظلم ہے ستم ہے نہیں کہیں امن ظالموں سے
زمین ساری کو میں نے کمزور کے لیے قتل گاہ پایا
بنے ہیں شیطان کے اطاعت گزار اہلِ زمانہ اکثر
اس کے نائب کو میں نے اہلِ جہاں کا سربراہ پایا
نہیں ہے انسانیت کسی میں نہیں ہے ہمدرد دل کسی میں
جسے چیئر مین میں نے دیکھا جسے یہاں بادشاہ پایا
وہ ظلم و جور و جفا کی شدت سے نیم بسمل بنا ہوا تھا
جسے بھی میں جہاں میں انسان دوست و خیر خواہ پایا

(صفحہ:25-26)

ایک مبصر کے طور پر جنابِ فاتح سیرِ دنیا کارواں تبصرہ پیش کرر ہے ہیں اور یہ تجزیہ ناقدانہ انداز میں کیا گیا ہے۔ چنانچہ وہ لکھتے ہیں کہ میں نے دنیا میں لوگوں کے دل کالی رات کی طرح سیاہ پائے ہیں۔ اہلِ عالم کا حال یہ ہے کہ کسی کو تو یہ بھی پتا نہیں کہ اس کی منزل کیا ہے اور اگر کسی پتا بھی ہے تو وہ یہ نہیں جانتا کہ اس کی منزل کو کون سا راستہ جاتا ہے۔ لوگ ہیں کہ جانوروں کی طرح رہ رہے ہیں۔ قیامت کی کوئی فکر نہیں ہے۔ گناہ کرتے ہی چلے جا رہے ہیں اور ان پر پچھتاوا بھی محسوس نہیں کرتے۔ حالت یہ ہے کہ غالب اکثریت پر معصیت زندگی گزار رہی ہے۔ ایک بے شرمی کا چلن ہے۔ یہاں تک کہ خدا کا بھی لحاظ نہیں کرتے اور نہ اس سے ڈرتے ہیں کہ کہیں اس کا قہر و غضب گرفت میں نہ لے لے۔ نہ نورِ ایماں ہے نہ جذبۂ غیرت ہے۔ ایک عالمِ بے حسی ہے۔ متاعِ دین لٹ رہی ہے مگر کسی کو اس کا کوئی دکھ نہیں، ملال نہیں۔ ہر طرف زمین فسادات سے معمور ہے۔ ظلمِ ظالم سے کسی کو پناہ نہیں ملتی۔ نوبت بہ ایں جا رسید کہ خدا کی ساری دھرتی ضعیف و کمزور کے لیے اور بے کس و بے نوا کے لیے مقتل بنی ہوئی ہے۔ دنیا والوں کا حال یہ ہے کہ وہ اکثر و بیشتر نفس اور شیطان کی غلامی پر کمر بستہ ہیں اور طاغوتی قوتوں کے گماشتے دنیا میں مناصبِ اعلیٰ پر فائز ہیں۔ ہمدردی اور مواسات کا بحران ہے۔ انسانیت کا فقدان ہے۔ یہاں تک کہ وہ لوگ بھی ان اوصاف سے عاری ہیں جنہیں صدر نشیں بنایا گیا ہے۔ یا مقامِ فرمانروائی پر مامور کیا گیا ہے۔ وہ شخص جو انسان دوستی اور خیر خواہی کے اوصافِ حمیدہ سے مزین ہے، اہلِ دنیا نے اس سے ایسا مخاصمانہ

برتاو کیا ہے کہ وہ افسردہ اور درماندہ ہے۔

نظمِ عالم پر یہ ایک ایسا بھرپور تبصرہ ہے جو سراسر انحرافی کیفیات پر مشتمل ہے۔ جس کے بارے میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ اس میں شدت پسندی سے کام لیا گیا ہے مگر دلِ حساس کی نظر میں یہ تلخ حقائق لائقِ مسامحت نہیں ہیں۔ جس طرح ایک فاضل ڈاکٹر کسی میں سرطان کی تشخیص کے بعد بہت پریشان و دل گرفتہ ہوتا ہے، اسی طرح ابوالبیان ظہور احمد فاتح بھی اہلِ دنیا کے عمومی چلن سے دل برداشتہ ہیں۔ وہ نہایت سوزِ دل کے ساتھ اس کا ذکر کرتے ہیں۔ یہ صرف ان پر منحصر نہیں۔ ہر فکرِ عمیق رکھنے والا سخن ور اسی انداز میں سوچتا ہے۔ جیسے میر درؔد نے کہا تھا:

زندگی ہے یا کوئی طوفان ہے
ہم تو اس جینے کے ہاتھوں مر چلے

غالبؔ نے کہا تھا:

زندگی اپنی جب اس حال میں گزری غالب
ہم بھی کیا یاد کریں گے کہ خدا رکھتے تھے

بقول ساحؔر:

زندگی کیا کسی مفلس کی قبا ہے جس میں
ہر گھڑی درد کے پیوند لگے جاتے ہیں

عدمؔ لکھتے ہیں:

جس تار کو چھیڑو وہی فریاد بلب ہے
اب ہم سے عدم ساز بجایا نہیں جاتا

بقول ساغؔر صدیقی:

زندگی جبرِ مسلسل کی طرح کاٹی ہے
جانے کس جرم کی پائی ہے سزا یاد نہیں؟

عین ممکن ہے ان حضرات کے دردِ دل کو غمِ ذات پر محمول کیا جائے اور فکرِ فاتح غمِ کائنات سے منسوب کی جائے تو اس صورت میں یہ بات اور بھی معتبر ہو جاتی ہے کہ بڑا انسان اور عظیم شاعر غمِ ذات سے ماورا ہو کر سوچتا ہے بلکہ غمِ کائنات اس کے لیے غمِ ہستی کا حوالہ ہوتا ہے۔

انسان کے لیے سب سے لازمی یہ بات ہے کہ اس میں احسان شناسی کا جوہر ہو، ماں باپ اور دیگر محسنین کی قدر پہچانے اور''ھل جزا الاحسان'' کے بمصداق ان سے معاملہ کرنے کے حوالے سے۔ پیارے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے فرمایا کہ ''تیرے تین باپ ہیں۔ایک وہ جو تیری پیدائش کا ذریعہ بنا۔دوسرا وہ جس نے اپنی بیٹی تیرے عقد میں دی۔تیسرا وہ جس نے تجھے علم سکھایا۔''اس حدیث میں عالمِ اسلام کے لیے ایک پیغامِ آداب ہے بلکہ پوری انسانیت اس سے مستفیض ہوسکتی ہے۔اسی طرح سکندر مقدونی نے کہا تھا کہ میرا استاد میرے باپ سے بہتر ہے کیونکہ میرا باپ مجھے آسمان سے زمین پر لایا اور میرے استاد نے پھر مجھے زمین سے آسمان پر پہنچا دیا۔ہمارے بزرگانِ دین بھی اساتذہ کا بے حد احترام کرتے تھے۔ایسی کئی روشن مثالیں تاریخِ عالم کے سینے میں محفوظ ہیں۔چنانچہ ابوالبیان ظہور احمد فاتح نے بھی ''استادِ محترم کے نام'' سے معنون ایک بہترین نظم رقم کی ہے جو ان کے جذباتِ قلبی کی آئینہ دار ہے۔یہ نظم انہوں نے اپنے زمانۂ طالب علمی میں لکھی تھی۔جب وہ انٹرمیڈیٹ میں زیرِ تعلیم تھے۔یہ نظم ان کی کتاب ''تصویرِ کائنات'' میں شامل ہے۔اس نظم کے اشعار آپ کے ذوقِ جمیل کی نذر ہیں:

اے مرے استاد اے خورشیدِ علم و آگہی
شیشۂ دل آپ کی یادوں سے ہو کیونکر تہی
آپ کا حق زندگی بھر میں چکا سکتا نہیں
بارِ احسانات سے خم سر اٹھا سکتا نہیں
میں کہ تھا نادان و کندہ نا تراش و ناشناس
اکتسابِ علم کی رکھتا تھا اپنے دل میں پیاس
آپ نے مجھ پر کیا یوں علم کا فیضانِ عام
جیسے تشنہ لب کو مل جائے چھلکتا جام
آپ کا طرزِ تعلم مشفقانہ دل گداز
اور اندازِ خطاب دل نشین و جاں نواز
آپ کی ہستی میں وہ سب خوبیاں موجود ہیں
جو قریباً آج کے استاد میں مفقود ہیں
آپ کی وہ سادگی وہ دل پذیری یاد ہے

بردباری خوش دلی روشن ضمیری یاد ہے
وہ قناعت وہ رواداری کی خو بھولی نہیں
علم کی وہ ایک پیہم جستجو بھولی نہیں
نقشِ دل ہے آپ کا وہ زہد و تقویٰ آج بھی
ہے تصور میں بزرگانہ سراپا آج بھی
آپ سے اے محترم ہر چند کافی دور ہوں
آپ کی یادوں کے شیریں جام سے مخمور ہوں
مہربانی آپ کی ہے جاں فزا میرے لیے
زادِ راہ ہے آپ کا حرفِ دعا میرے لیے

(صفحہ 48-49)

نظمِ ھٰذا میں وہ تمام خوبیاں جو استاد سے متعلق ہوسکتی ہیں، جنابِ فاتح نے رقم کی ہیں جس میں استادِ محترم کو خورشیدِ علم و آگہی قرار دیا ہے۔ جو ایک عظیم استعارہ ہے۔ استاد جو ناقابلِ فراموش ہستی ہے، جس کا حق عمر بھر ادا نہیں ہوسکتا۔ استاد کا فیضانِ تعلم ایک لیس بہ شئے کو جوہرِ کامل بنا دیتا ہے۔ جس کا پڑھانے کا انداز مشفقانہ اور دل نشیں ہوتا ہے، وہ استاد منفرد استاد ہے جو عصرِ حاضر کے عام استادوں سے مختلف ہے۔ گویا اقسامِ اساتذہ کا ایک تقابلی جائزہ لیا ہے جو بلیغ تنقیدی شعور کا مظہر ہے۔ نظم ظاہر کرتی ہے کہ سیرتِ استاد میں سادگی اور مقناطیسیت کا جوہر بھی ہونا چاہیے۔ صبر وتحمل، خوش دلی اور روشن ضمیری کے اوصافِ جمیلہ سے استاد کی سیرت مہکی ہونی چاہیے۔ طبعِ استاد میں خوئے قناعت و رواداری ضرور ہونی چاہیے۔ اسے زاہد و متقی ہونا چاہیے اور ذخیرہ ءِ دانش میں اضافہ کرتے رہنا چاہیے۔ استاد کا انداز بزرگانہ وکریمانہ ہو۔ شخصیت نگاری کے ان محاسن کے ساتھ ساتھ استاد سے جذباتی ونفسیاتی وابستگی کا پرتو بھی اس نظم کا حصہ ہے اور نظم کا اختتامیہ التماسِ دعا پر مشتمل ہے کیونکہ استاد کی دعا بھی شاگرد کے لیے زادِ راہ کا درجہ رکھتی ہے۔

وہ آلاتِ علم ہوں یا وسائلِ دانش، درسگاہ ہو یا مدرس، ایک اچھا شاگرد ہمیشہ ان کی قدر ومنزلت کرتا ہے۔ جیسے حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے فرمایا تھا کہ جس نے مجھے علم کا ایک لفظ سکھایا، اس نے ساری زندگی کے لیے مجھے غلام بنا لیا۔ لہٰذا یہ بھی عین دانش مندی اور حکمتِ شاعری ہے کہ استاد کی تکریم وقدر افزائی کو

لازمہ سمجھا جائے اور اس کے ادب واحترام میں کوئی دقیقہ فروگزاشت نہ کیا جائے۔ یہی درسِ زریں ابو البیان ظہور احمد فاتح کی حکیمانہ اور دانش مندانہ شاعری سے ملتا ہے اور یہی علم دوست لوگوں کو وطیرہ رہا ہے۔ دنیا میں کوئی شخصیت محنت کے بغیر استوار نہیں ہوئی اور کوئی اہم کام محنت کے بغیر شاہکار نہیں بنا۔ کوئی معرکہ محنت کے بغیر سر نہیں ہوا۔ نیز کوئی امتحان محنت کے بغیر پاس نہیں کیا جاسکا۔ لہٰذا محنت کلیدی حیثیت کی حامل ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ابو البیان ظہور احمد فاتح نے اپنے عرفان آمیز سخن میں ''تلقینِ محنت'' کے عنوان سے ایک نظم رقم کی ہے۔ لطف کی بات یہ ہے کہ ان کی یہ نظم بھی زمانۂ طالب علمی کی تخلیق ہے جو طالب علموں کے لیے خصوصاً اور عوام الناس کے لیے عموماً آدرش کا درجہ رکھتی ہے۔ نظم حسبِ ذیل ہے:

اے دوستو محنت کرو نزدیک تر ہے امتحاں
آپ کا یہ لمحہ قیمتی ہے بے گماں
قیمتی لمحات کو ضائع کبھی جانے نہ دو
دھبہ اپنے نام پر یارو کوئی آنے نہ دو
وقت گر جانے دیا ناکام ہو جاؤ گے تم
سال کھو بیٹھو گے تم آخر میں پچھتاؤ گے تم
ایک کر دو گے پڑھائی میں اگر لیل و نہار
تو سنہری کامیابی کا کرو گے انتظار
ہر جگہ یہ آپ کا چرچا بپا ہو جائے گا
نام روشن آپ کے ماں باپ کا ہو جائے گا
کامیابی کے لیے تم رات دن محنت کرو
غفلتوں سے باز آؤ سستیاں رخصت کرو

(''تصویرِ کائنات''۔ صفحہ 65)

طالب علم شاعر اپنے ہم درس گاہ طلبا کو درسِ محنت دے رہا ہے کیونکہ امتحان قریب تر ہے۔ وقت کا ایک ایک لمحہ بے حد قیمتی ہے۔ لہٰذا خوب پڑھائی کی جائے۔ مطالعہ و تحقیق میں وقت صرف کیا جائے۔ کھیل کود اور تفریح و عیاشی کو خیر باد کہہ دیا جائے اور اشغالِ دیگر سے گلوخلاصی کرالی جائے۔ نیند سے وقت بچا کر اسے صرفِ مطالعہ کیا جائے۔ طلبا میں یہ احساس جاگزین ہونا چاہیے کہ اگر محنت نہیں کریں گے تو ناکام ہو

جائیں گے۔ اگر نا کام ہو گئے تو رسوائی و خفت ہو گی۔ اگر پڑھائی میں روز و شب ایک کر دیے جائیں تو انسان سنہری کامیابی حاصل کرتا ہے جس کے نتیجے میں نیک نامی اور اعلیٰ منصبی کے امکانات بڑھ جاتے ہیں۔ استاد، درس گاہ اور والدین کا نام روشن ہوتا ہے۔

یہاں یہ امر مترشح ہے کہ ابوالبیان ظہور احمد فاتح اپنے منصبِ آموزش سے غافل نہیں وہ نسلِ نو کی بہترین تربیت کے لیے اپنی شاعرانہ مساعی کو موثر بناتے ہیں۔ یہ نظم اپنے فحوائے سخن میں علم، وقت اور محنت کے عناصرِ ثلاثہ کی قدر کو ظاہر کرتی ہے۔ مزید برآں اس سے ان کے نظریۂ ادب برائے زندگی پر بھی روشنی پڑتی ہے اور ذہنی بیداری کے حوالے سے یہ نظم خاص کردار ادا کرتی ہوئی محسوس ہوتی ہے۔ لہٰذا ہم اسے سرمایۂ حکمت و دانش کا ایک لعلِ نایاب قرار دے سکتے ہیں۔

ہر کام کے کچھ آداب ہوتے ہیں جنہیں ملحوظ رکھنا بے حد ضروری ہوتا ہے۔ محبت جو مہتم بالشان عمل ہے، اس میں بھی آداب کا خیال کرنا ناگزیر ہے۔ بقول اقبال:

ادب پہلا قرینہ ہے محبت کے قرینوں میں

اس حوالے سے ابوالبیان ظہور احمد فاتح کی ایک نظم دامن کش ہے جس کا عنوان ہے ''آدابِ محبت'' یہ نظم ان کے شعری مجموعے ''تصویرِ کائنات'' سے لی گئی ہے۔ دیکھیے کیا فرماتے ہیں:

بہت خوب ہے دل لگانے کی عادت
مگر چاہیے دکھ اٹھانے کی عادت
محبت میں لازم ہے صبر و تحمل
ستم سہہ کے ہو مسکرانے کی عادت
اگر درد و غم سے ہو جینا بھی دوبھر
نہ ہو قصۂ غم سنانے کی عادت
نظر سے ادا ہوں محبت کی باتیں
کہ معیوب ہے لب ہلانے کی عادت
نہ ظاہر ہو چہرے سے کیفیتِ دل
ہو یوں حالتِ دل چھپانے کی عادت
یہ لازم ہے عاشق سراپا رضا ہو

نہ ہو لب پہ فریاد لانے کی عادت
عزیزوں کو چند ایک بار آزما لو
غلط ہے سدا آزمانے کی عادت
اے فاتحؔ! نہ کر فکرِ تنقید ہرگز
ہے تنقید کرنا زمانے کی عادت

(صفحہ:74-75)

بقول جنابِ فاتح محبت میں حسبِ ذیل آداب کا خیال رکھنا ضروری ہے جنہیں ضابطۂ شوق قرار دیا جاسکتا ہے۔ دل لگانا برا نہیں مگر اس میں درد و غم جھیلنے کا یارا بھی ہونا چاہیے۔ ضبط و تحمل راہِ عشق میں ضروری ہے۔ ایسا ظرف ہونا چاہیے کہ آدمی ظلم سہہ کر بھی مسکرانا جانتا ہو۔ اگر عشق زندگی اجیرن بھی کر دے تو بھی خیالِ رازداری رہنا چاہیے۔ راہِ الفت کے راہیوں کو زیادہ تر گفتگو آنکھوں کے ذریعے کرنی چاہیے کہ اس راستے میں زیادہ زبانی گفتگو بھی مضر ثابت ہوتی ہے۔ دل پر چاہے جو گزر رہی ہو، اس کا عکس چہرے پر نہیں پڑنا چاہیے۔ گویا حالِ دل چھپانے کا پورا پورا ملکہ حاصل ہونا چاہیے۔ عشق میں خوئے تسلیم و رضا تلازمے کا درجہ رکھتی ہے لہٰذا آہ و فریاد اور نالہ و شیون عشاقِ غیر پختہ کار کا کام ہے۔ پہلے تو کسی کو آزمائش میں ڈالنا ہی نہیں چاہیے۔ اگر آزمانا ضروری بھی ہو تو ایک آدھ بار امتحان لینا کافی ہے۔ بار بار معرضِ ابتلا میں ڈالنا غیر مناسب ہے۔ اہلِ دل کو تنقید اور نکتہ چینی سے بے نیاز رہنا چاہیے کیونکہ یہ تو اہلِ دنیا کا معمول ہے کہ ہر معاملے میں بال کی کھال نکالتے رہتے ہیں۔

نظم کے مطالعہ سے یہ بات روزِ روشن کی طرح واضح ہو جاتی ہے کہ فاتح جی اسرار و رموزِ محبت میں کافی مہارت رکھتے ہیں بلکہ انہیں پریم گرو کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا۔ ان کی ہر رومانوی نظم خود میں ایک درسِ محبت رکھتی ہے۔ ہر نگارش میں ایک نہ ایک چاہتی تجربہ موجود ہے۔ وہ کاروبارِ شوق میں زبردست دستگاہ رکھتے ہیں۔ یوں لگتا ہے کہ ان کی نس نس میں رومان رچا ہوا ہے۔ وہ سلطان العاشقین کے مقام پر فائز ہیں۔ لہٰذا ان سے بہت کچھ لیا اور سیکھا جاسکتا ہے۔ شاید قدرت نے انہیں شاعر ہی اس لیے بنایا ہے کہ وہ مسافرانِ الفت کی رہنمائی کر سکیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ آگہی و رہنمائی خود میں بے پناہ سرمایۂ دانش و حکمت رکھتی ہے۔ چاہے عشقِ حقیقی ہو یا عشقِ مجازی، دانشِ عشق اور فلسفۂ محبت سے عدم واقفیت کی صورت میں انسان کو مایوس کن حالات کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ اس سلسلے میں کلامِ فاتح خضرِ راہ کا

کردار ادا کرنے والا ہے۔علامہ اقبال نے کہا تھا:

ستیزہ کار رہا ہے ازل سے تا امروز
چراغِ مصطفوی سے شرارِ بو لہبی

جہاں کہیں اہلِ حق فروغِ دانش کے لیے اٹھے، وہیں اہلِ باطل تحفظِ ظلمت کے لیے کھڑے ہو گئے۔ جہاں اربابِ وفا نے شمعِ خلوص روشن کی ہیں، وہاں وفا دشمن عناصر اسے گل کرنے کے لیے مضطرب ہو گئے۔لہٰذا یہ دنیا کا چلن رہا ہے کہ آویزشِ ضدین جاری وساری ہے۔اسی قاعدے کلیے کے بموجب ابو البیان ظہور احمد فاتح نے نظم ''ہم اور ہمارے مخالف'' تحریر کی ہے جو ان کی کتاب ''چہرۂ ہستی''، مطبوعہ 2014ء کا حصہ ہے۔ہم یہاں وہ نظم نقل کر رہے ہیں:

اپنی خواہش ہے کہ ہو نورِ ہدایت کو فروغ
ان کی منشا ہے کہ ہو طوفانِ ظلمت کو فروغ
ہم مسلماں ہیں ہمارا ایک ہی معبود ہے
اپنی کوشش ہے کہ ہو آئینِ وحدت کو فروغ
وہ حلیفِ اہرمن ہیں شرک ہے ان کا طریق
ان کی سازش ہے کہ ہو میلانِ دولت کو فروغ
ہم جہاں میں چاہتے امن و انصاف وسکوں
ہم ہیں سرگرمِ عمل کہ ہو شریعت کو فروغ
وہ تشدد اور بدامنی کے خواہش مند ہیں
ان کے دم سے ہے فساد و جبر ونخوت کو فروغ
ہم اخوت کا رواداری کا دیتے ہیں پیام
ہے ہماری آرزو کہ ہو محبت کو فروغ
وہ عناد و بغض و خود غرضی کے خوگر ہیں سدا
ان کی مرضی ہے کہ ہو تحقیر و نفرت کو فروغ
اپنی خواہش ہے کہ احسان و مروت عام ہو
دہر میں ہو احترامِ آدمیت کو فروغ

وہ لٹیرے ہیں فریب و مکر ان کا کیش ہے
ان کی ضد ہے کہ ہو ظلم و بربریت کو فروغ
ہم سدا کوشاں ہیں اصلاح و ترقی کے لیے
اپنی خواہش ہے کہ ہو حق و صداقت کو فروغ
وہ بپا کرتے ہیں تخریب و تباہی دہر میں
ان کی کوشش ہے کہ ہو کفر و جہالت کو فروغ

(صفحہ:19-20)

حقیقی اہل، دانش وہ ہے جو اسبابِ دانش کو عام کرنا چاہتا ہے اور یہی ذمہ داری ہم نے لے رکھی ہے جبکہ ہمارے مخالف یہ شدت سے چاہتے ہیں کہ طوفانی اندھیرے ہر طرف پھیل جائیں۔ ہم اہلِ ایمان اور مواحد ہیں اور دستورِ وحدت کو عام کرنا چاہتے ہیں جبکہ ہمارے مخالفین طاغوت کے گماشتے ہیں۔ اس لیے شرک پر کمر بستہ ہیں اور ان کی خواہش ہے کہ دنیا میں دنیا داری عام ہو جائے۔ ہمارا کیش یہ ہے کہ امن و انصاف وسکون کی عملداری ہو لہٰذا فروغِ شریعت کی بھرپور کوشش کر رہے ہیں۔ حریف شدت پسندی اور فساد پر عمل پیرا ہیں۔ وہ ظلم و جبر و دہشت کو فروغ دیتے رہتے ہیں۔ اپنا یہ طریق ہے کہ مساوات واخوب اور رواداری کے داعی ہیں اور ہم فروغِ محبت کے دعوے دار ہیں۔ مخالفین بغض و کینہ اور مطلب پرستی کی روش پر کاربند ہیں۔ لہٰذا وہ نفرت وحقارت عام کرنے والے ہیں۔ ہم یہ چاہتے ہیں کہ دنیا میں مروت و احسان کا دور دورہ ہو اور لوگ تکریمِ انسانیت کا سبق سیکھ جائیں۔ حریفوں کا کام لوٹ کھسوٹ مچانا، مکر و فریب سے خلقِ خدا کو گمراہ کرنا ہے۔ وہ ہمیشہ ظلم و بربریت میں مبتلا رہتے ہیں۔ ہمارا انداز یہ ہے کہ اصلاح و ترقی کا دم بھرتے ہیں۔ لہٰذا حق و صداقت دنیا میں عام کرنا ہمارا منشور ہے۔ حریفوں کا یہ شیوہ ہے کہ وہ تخریب کاری اور تباہی و بربادی کے لیے سرگرم رہتے ہیں۔ کفر و جہالت کا فروغ ان کا مطمعٔ نظر ہے۔ اس تقابل سے یہ پتہ چلتا ہے کہ ہماری سمت مثبت ہے۔ ہم خلقِ خدا کو ہر لحاظ سے فائدہ پہنچانا چاہتے ہیں۔ یہی اہلِ دانش و عرفان کا انداز ہے جبکہ ہمارے مخالفین منفی ہتھکنڈوں پر اتر آئے ہیں۔ خدا کے بندوں کو تکلیف و اذیت دیتے رہتے ہیں اور یہی اہلِ شر کا شیوہ ہے جو سدا کارِ جہالت کرتے ہیں۔ نظم ھٰذا سے حکمت و بصیرت، دانش و آگہی کی اہمیت و ضرورت اور افادیت آشکار ہوتی ہے۔ درحقیقت یہی کلامِ فاتح کا خاصا ہے۔

ابوالبیان ظہور احمد فاتح کے پیرایۂ شعر میں عمرانی ادراکات

عمرانیات ایک بہت وسیع مضمون ہے جو ہمارے رہن سہن، عقائد و اعمال، رسوم و اطوار، اخلاقیات و عادات اور تہذیب و تمدن پر روشنی ڈالتا ہے۔ یہ بظاہر ایک خشک موضوع نظر آتا ہے مگر اس میں پذیرائی کے گہرے امکانات پائے جاتے ہیں۔ بعض شعرا قدرتی طور پر عمیق سماجی شعور سے متمتع ہوتے ہیں۔ ان میں سے نظیر اکبر آبادی اور اکبر الہ آبادی کو بطور نظیر پیش کیا جا سکتا ہے۔ اگر ہم ابوالبیان ظہور احمد فاتح کے ذخیرۂ کلام کا جائزہ لیں تو محسوس ہو گا کہ ان کے ہاں بھی وسیع تر عمرانی ادراکات پائے جاتے ہیں جن کے باعث ان کا کلام سوشل سائنس کے بارے میں جامع جانکاری کا درجہ رکھتا ہے۔ ذیل میں ہم چند ایسے استشہادات لا رہے ہیں جن سے ہمارے نقطۂ نظر کو تقویت ملے گی اور قاری پر بھی یہ بات روزِ روشن کی طرح عیاں ہو جائے گی۔

ہماری عمرانیات میں شعبۂ موسیقی کا بھی بڑا عمل دخل ہے۔ خصوصاً مطربہ کی بڑی شان ہے۔ ابو البیان ظہور احمد فاتح اس سے بہت متاثر نظر آتے ہیں۔ چنانچہ ان کی ایک نظم ''مطربہ'' شاملِ در ''سنہرے خواب مت دیکھو'' مطبوعہ دسمبر 2004ء اسی کیفیت کی حامل ہے۔ نظم بڑی متاثر کن ہے۔ ذیل میں ہم اس کا اندراج عمل میں لا رہے ہیں۔

بتا رے مطربہ تو نے
یہ کیسا گیت گایا ہے؟

یہ کیسا ساز چھیڑا ہے؟
کہ جس کی دکھ بھری لے نے
سکوں میرا چرایا ہے
مجھے بسمل بنایا ہے
بتا اے مطربہ تجھ کو
یہ کیسا رنج لاحق ہے؟
یہ کیسا غم ستاتا ہے؟
کہ تیری دکھ بھری دھن سے
مرے جذبات جاگے ہیں
بتا اے مطربہ تو نے
یہ کیا سنگیت چھیڑا ہے؟
کہ تیرا درد میرے درد کا عکاس ٹھہرا ہے
ترے دکھ نے مرے دکھ کو جگایا ہے
بتا اے مطربہ کیا راز ہے اس میں
کہیں تو بھی مری صورت نہ ہو اخلاص کی پیاسی

بعض مغنی یا مغنیہ اس انداز میں نغمہ سرا ہوتے ہیں کہ دنیائے دل تہ و بالا ہو کر رہ جاتی ہے۔ غالباً یہ بھی ایسی ہی تاثراتی نظم ہے جس میں مطربہ کے ترنم نے شاعر کو بہت متاثر کیا ہے۔ چنانچہ وہ اس سے سوال کر بیٹھے ہیں۔ اے گانے والی! آج تو نے ایک ایسا گیت چھیڑ دیا ہے کہ تیرے گیت نے مجھے تڑپا کے رکھ دیا ہے۔ میرے دل کا سکون و سرور چرا لیا ہے۔ یوں محسوس ہوتا ہے کہ تجھے بھی میری طرح کوئی روگ، کوئی غم ضرور لاحق ہے۔ کوئی ایسا حزن ضرور تجھ میں کارفرما ہے جس نے میرے جذبات کو جگا دیا ہے۔ اے گانے والی! تو نے کسی ساز پر زخمہ لگایا ہے۔ تیری درد بھری لے میرے پرسوز جذبات کی عکاسی کر رہی ہے۔ تیرا دکھ میرے دکھ کی بیداری کا باعث بنا ہوا ہے۔ اے مطربہ! ضرور اس میں کوئی راز چھپا ہوا ہے۔ شاید تو بھی میری طرح محبت کی پیاسی ہے۔

ظہور احمد فاتح خود فنونِ لطیفہ سے متعلق ہیں لہٰذا فنکاروں کے سچے قدردان بھی ہیں۔ وہ گلوکاروں

سے محبت کرتے ہیں۔خصوصاً ملکہ ترنم نور جہاں کے گہرے قدر دان ہیں۔اس کے نام انہوں نے ایک نظم بھی کہی ہے جس کا پہلا شعر کچھ یوں ہے:

اے حسنِ آواز کی دیوی خوش الہامی کی شہزادی
تیرے ہی دم سے افروزاں ہے زمزمۂ نغمات کی وادی

اکبرالہ آبادی نے کہا تھا:

انہیں ذوقِ عبادت بھی ہے اور گانے کی عادت بھی
نکلتی ہیں دعائیں ان کے منہ سے ٹھمریاں ہو کر

ابوالبیان ظہور احمد فاتح کا بھی یہی عالم ہے کہ وہ فنونِ لطیفہ کے بھی رسیا ہیں۔ساتھ ہی ساتھ دینیات میں بھی رسوخ رکھتے ہیں۔

جہاں وہ زمرۂ نوا، فنکاراں میں شامل ہیں، وہاں وہ ایک واعظِ رنگیں ندا بھی ہیں۔ یہاں ہم ان کی ایک نظم بعنوان ''نصائح'' مشمولہ ''کچھ دیر پہلے وصل سے'' مطبوعہ 2009ء رقم کر رہے ہیں جو ان کے دینی رجحانات کی ترجمان ہے۔ دراصل سماجیات میں عقیدہ و دین و مذہب کو بنیادی حیثیت حاصل ہے۔ کہا جاتا ہے کہ دین وایمان گیا تو سب کچھ گیا۔ مذیب نہیں تو کچھ بھی نہیں۔منکرِ مذہب کافر وملحد کہلاتا ہے اور دینی احکام وفرامین کی پابندی کرنے والا راسخ العقیدہ انسان کہلاتا ہے۔ یہی عالم ابوالبیان ظہور احمد فاتح کا ہے۔ان کی نصائح ملاحظہ ہوں:

حالِ خستہ اہلِ دنیا سے چھپانا چاہیے
دل ہو رنجیدہ تو پھر بھی مسکرانا چاہیے
کاہلوں کو کام کا خوگر بنانا چاہیے
غافلوں کو خوابِ غفلت سے جگانا چاہیے
عہدو پیماں کر کے ہر صورت نبھانا چاہیے
جرم ہے کتمانِ حق ہے اس سے بچنا ناگزیر
جو حقیقت ہو زمانے کو بتانا چاہیے
روشنی نورِ تیقن سے سدا کرتے رہو
ظلمتِ اوہام دنیا سے مٹانا چاہیے

ہے خدائے دو جہاں کو یہ ادا بے حد پسند
رنج و درد و غم سے خلقت کو بچانا چاہیے
لہجہ شیریں ہو لبوں پر ہو تبسم دل نواز
دوستوں سے مخلصانہ پیش آنا چاہیے
نامناسب ہے انا کا خود پسندی کا چلن
روٹھنے والے عزیزوں کو منانا چاہیے
جمع کا ہو شوق تو علم و دانش کا حصول
ہے مذاقِ کسب تو نیکی کمانا چاہیے
دوسروں کو جو کرے برباد وہ انساں نہیں
جو اجڑ جائیں سدا ان کو بسانا چاہیے
نفرتیں عصبیتیں اہلِ جہاں میں عام ہیں
مشعلِ مہر و وفا داری جلانا چاہیے

(صفحہ 48 تا 50)

نظم ھٰذا میں پروفیسر ظہور احمد فاتح عمومی عمرانی اصول سمجھانے کی کوشش کر رہے ہیں۔ وہ ہدایت کر رہے ہیں کہ ہمیں اپنا حالِ خستہ دنیا والوں سے چھپا کر رکھنا چاہیے یہاں تک کہ دل کے بھی ٹکڑے ہو رہے ہوں تب بھی ہمیں مسکرانا چاہیے۔ سبب یہ ہے کہ لوگ درماندہ و پریشان لوگوں سے منہ موڑ لیتے ہیں اور ہنستے گاتے لوگوں کے ساتھی بن کر رہتے ہیں۔ جو لوگ ہمارے درمیان سست واقع ہوئے ہیں، انہیں کام کا خوگر بنائیں۔ جو لوگ غفلت میں مبتلا ہیں، ہمیں چاہیے کہ انہیں ہوشیار کر دیں۔ کسی ایک سے اگر وعدہ و پیمان کریں تو اسے ضرور پورا کریں۔ اگر ہم کسی کے مقروض ہوں تو ہمیں چاہیے کہ جلد از جلد قرض ادا کر دیں۔ حق کو چھپانا جرم ہے اور جرم سے بچنا انتہائی ضروری ہے۔ البتہ حقائق سے ضرور پردہ اٹھاتے رہیں۔ یقین نور ہے۔ نور یقیناً اہلِ دنیا کو پہنچاتے رہیں اور توہمات کی تاریکیاں ہمیں مٹا دینی چاہییں۔ اللہ تعالیٰ کو یہ ادا بہت پیاری ہے کہ ایک انسان دوسرے انسان کو تکالیف و مصائب سے بچاتا ہے۔ ہمیں چاہیے کہ ہم خوش اخلاق بن کر زندگی گزاریں۔ لب و لہجہ میٹھا ہو اور ایک لطیف مسکراہٹ ہمارے لبوں پر ثبت ہو۔ ہمیشہ دوست احباب سے مخلصانہ رویہ ہونا چاہیے۔ انا پرستی اور خود پسندی کوئی اچھا انداز

نہیں ہے۔ اگر اعزا و اقربا کسی وجہ سے روٹھ رہے ہوں تو فوراً انھیں منا لینا چاہیے۔ اگر ذخیرہ اندوزی اور پس اندازی کا شوق ہے تو علم و ہنر جمع کرو اور اگر کمائی کا جذبہ رکھتے ہو تو زیادہ سے زیادہ نیکیاں کماؤ۔ انسان جو اوروں کے لیے وجہ مضر ہو کبھی اچھا انسان نہیں ہو سکتا۔ البتہ اجڑے ہوئے لوگوں کو بسانے کی فکر ضرور کرنی چاہیے۔ عصرِ حاضر میں نفرت و تعصب کا چلن عام ہے۔ ہمیں چاہیے کہ ہم دنیا میں مہر و وفا کی شمعیں جلاتے چلے جائیں۔

اگر ژرف نگاہی سے مطالعہ کیا جائے تو ان کی یہ نظم مثالی معاشرہ قائم کرنے میں کلیدی کردار ادا کر سکتی ہے۔ حکمائے یونان نے جو مثالی معاشرت کا تصور پیش کیا تھا، اور قرآن و حدیث کی اساسیات جو اعلیٰ تر سماج کے لیے ناگزیر ہیں، نظمِ ھٰذا میں ان کی عکاسی پائی جاتی ہے۔

آگے چلتے ہیں تو ان کے اسی مجموعہ شعر یعنی ''کچھ دیر پہلے وصل سے'' میں شامل ایک اور نظم بعنوان ''کیا کروں؟'' ہماری راہ روکتی ہے۔ یہ نظم بھی مثبت عمرانی سرگرمیوں کی حوصلہ افزائی کرتی ہے اور منفی سماجیات کی نفی کرتی ہے۔ نظم درج ذیل ہے:

دیکھ کر اہلِ جہاں کی بے رخی
جی یہ چاہے تارکِ دنیا بنوں
کیا کروں رہبانیت جائز نہیں
بدسلوکی دیکھ کر احباب کی
دل یہ چاہے سب سے ناتا توڑ لوں
قطعِ رحمی کا نہیں لیکن جواز
دوستوں کی سرد مہری دیکھ کر
من کہے کہہ دوں وفا کو خیر باد
کیا کروں ترکِ وفا زیبا نہیں؟

(صفحہ 80)

دنیائے دنی میں حضرتِ انسان طرح طرح کے تجربات و مشاہدات سے گزرتا ہے جن کے ردعمل کے طور پر گوناگوں جذبات و خیالات جنم لیتے ہیں۔ نظم کا آغاز کچھ یوں ہوتا ہے کہ اہلِ دنیا کی بے رخی اور سرد مہری دیکھ کر دل میں خیال آتا ہے کہ دنیا کو خیر باد کہہ دیجیے اور تارک الدنیا بن جائیے لیکن پھر سوچتے

ہیں کہ ازروئے شریعت ایسا کرنا جائز نہیں۔ جبکہ احباب کی بدسلوکیاں سامنے آتی ہیں تو جی چاہتا ہے کہ رشتے داریوں کو ختم کر دیا جائے لیکن پھر سوچتے ہیں کہ صلہ رحمی ضروری ہے۔ قطع تعل ناجائز عمل ہے۔ پھر جب یاروں کی سرد مہری پر نگاہ پڑتی ہے تو خیال آتا ہے کہ مہر و وفا کو خیر باد کہہ دیا جائے لیکن وفا کو چھوڑ دینا مردانِ وفا کے شایانِ شان نہیں ہے۔

ایک عجیب استدلال ہے جسے قدم قدم پر خود ہی رد کیا جا رہا ہے۔ بیزاری کی کیفیت پیدا ہوئی ہے لیکن دینی پاکیزگی اس کا ازالہ کر دیتی ہے۔ غصہ اپنا رنگ دکھانے لگتا ہے تو آبِ صبر و شکیب اس کی آتشِ عدوان کو فرو کر دیتا ہے۔ لہٰذا یہ کہنا پڑے گا کہ بالواسطہ طور پر نظم ھٰذا میں مکارمِ اخلاق کی تعلیم دی گئی ہے۔ اتباعِ کتاب و سنت کا درس دیا گیا ہے جسے ہم وسیع تر معاشرتی اور تہذیبی و تمدنی شعور سے ہم آہنگ سمجھتے ہیں۔ گویا یہ نظم بھی عمرانی ادراکات کا مرقع ہے۔

شاعرِ حق گو اگر تعریف و توصیف پر اترتا ہے تو لطف آجاتا ہے اور اگر وہ ہجو گوئی یا تنقید پر اتر آئے تو مذمت کے انبار لگا دیتا ہے۔ یہی کیفیت ابوالبیان ظہور احمد فاتح کی نظم ''تمہارے شہر کے باسی'' شاملِ در ''کچھ دیر پہلے وصل سے'' پیشِ خدمت ہے۔ جس سے ان کی طلاقتِ لسانی کا اندازی بخوبی لگایا جا سکتا ہے۔ لیجئے پڑھیے:

تمہارے شہر کے باسی
نہایت بے مروت ہیں
وفا کیشوں کے دشمن ہیں
یہ قاتل ہیں محبت کے
یہ رہزن سکھ سکوں کے ہیں
تمہارے شہر کے باسی
یہ خوگر ہیں تصنع کے
یہ عادی ہیں تکلف کے
یہ خادم اہلِ زر کے ہیں
انہیں کیا ہے غریبوں سے؟
غرض کیا دردمندوں سے؟

کسی بے کس سے کیا مطلب؟
بہت بے رحم لگتے ہیں
تمہارے شہر کے باسی

(صفحہ 88-89)

شاعر اپنے محبوب سے مخاطب ہے اور شکوہ گزار ہے کہ تمہارے شہر کے باسی بڑے بے مروت ہیں۔انہیں اہلِ وفا سے دشمنی ہے۔ یہ لوگ محبت کے قاتل ہیں۔ یہ سکھ سکوں لوٹ لیتے ہیں۔ ان کا کام بناوٹ کرنا ہے۔تکلفات ان کا اوڑھنا بچھونا ہیں۔ اہلِ زر کی خدمت ان کا مشرب ہے۔غریبوں سے انہیں کچھ لینا دینا نہیں ہے۔ نہ یہ درد رکھتے ہیں اور نہ کسی کا درد بانٹتے ہیں۔ان لوگوں کو کسی بے کس سے کوئی سروکار نہیں ہے۔ یہ کسی کی غم خواری نہیں کرتے۔تمہارے شہر کے باشندے بڑے سنگ دل، بے وفا، بے مروت اور جلاد منش ہیں۔

مجموعی طور پر یہ نظم گہرے تنقیدی شعور اور شدید معاشرتی انحرافات کا مجموعہ ہے۔شاعر اپنے سماج سے خفا ہے اور اس کا بالواسطہ شکوہ کر رہا ہے۔تخاطب محبوب سے ہے اور بات اہلِ دنیا کی ہو رہی ہے۔ عیب ان کے گنوائے جا رہے ہیں اور ملامت محبوب کے کھاتے میں جا رہی ہے۔ یہ ایک آزاد نظم ہے لیکن لگتا ہے کہ ایک مالا ہے جس میں فکر کے موتی پرو دیے گئے ہیں۔ گویا یہ سماجی رویوں پر صدائے احتجاج ہے۔لوگوں کی واژگونی پر ایک ہجو ہے۔عمرانی رویوں کا جلتا ہوا جواب ہے۔

ہمارے عمرانی تفاعلات میں ایک بھرپور تفاعل محبت بھی ہے بلکہ بعض ماہرینِ عمرانیات اسے ایک بنیادی تفاعل قرار دیتے ہیں۔شاید ابوالبیان ظہور احمد فاتح اس موقف سے پورا اتفاق کرتے ہیں کیونکہ ان کے سخن میں بھی محبت کا کردار اساسی ہے اور اپنا خیال تو یہ ہے کہ وہ محبت کے صرف نظری پہلو تک رہنا نہیں چاہتے بلکہ اس سے آگے کہیں اس کے اطلاقی پہلو تک پہنچنا چاہتے ہیں۔ وہ معراجِ محبت کے قائل ہیں۔ ان کی ایک نظم ''غمِ ہجر'' اس وقت ہمارے سامنے ہے جس میں ان کی روح بولتی ہوئی محسوس ہو رہی ہے۔ سوز و گداز کا جو عالم اس نظم میں ہم نے محسوس کیا ہے، وہ یقیناً کوئی بڑا اہلِ دل ہی رقم کر سکتا ہے۔نظم دیکھیے:

کر رہا ہوں رات دن میں آہ کس کی جستجو؟
کس کی یادیں پی گئیں میرے کلیجے کا لہو؟
کس کی فرقت میں مسلسل رات دن روتا ہوں میں؟

اپنے اشکوں ہی سے ہو جاتا ہے اب میرا وضو
کون اپنے یار سے ناراض ہو کے چل دیا؟
رُک گئی کس کے نہ آنے سے عبائے مشک بو؟
کر رہا ہوں رات دن صبح و مسا کس کی تلاش؟
پھر رہا ہوں حالتِ دیوانگی میں چار سو
تھا مرا دلدار جس نے مجھ کو تنہا کر دیا
وہ مری جانِ تمنا میری جانِ آرزو
چل دیا ناراض ہو کے مجھ سے اک مدت ہوئی
وہ مرے دل کا سہارا وہ حسین و خوب رو
اس کے رنجِ ہجر میں ایسا ہوا بے حال میں
کچھ نظر آتا نہیں مجھ کو جہانِ رنگ و بو
باوجودِ سعی ء پیہم وہ مجھے ملتا نہیں
پھر رہا ہوں اس کو پانے کے لیے میں کو بہ کو
کاش یاد آتا اسے فاتح وہ پیمانِ وفا
وہ ملاقاتیں وہ باتیں پیار کی وہ گفتگو

(صفحہ:101-102)

یہ نظم جو ایک غیر مردف غزل کی ہئیت میں رقم کی گئی ہے، خود میں بلا کا تسلسل رکھتی ہے۔ اسے دلِ عاشق کی واردات کہا جائے تو بے جا نہ ہو گا۔ محبوب سے تخاطب ہے۔ اولین مصرعے میں آہ کی فضا پائی جاتی ہے جیسے تلاش کے سفر میں کوئی تھک ہار چکا ہو۔ رنجِ فراق نے اس کے بدن سے خون کا آخری قطرہ تک نچوڑ لیا ہو۔ ہجرِ یار میں ہر آن رونے دھونے سے واسطہ رہتا ہے۔ مبالغہ یہاں تک ہے کہ اب اشکوں سے ہی شاعر باوضو رہتا ہے۔ یہ دلبرِ مغرور کی ناراضی کا نتیجہ ہے۔ یوں لگتا ہے کہ اب تو صبائے معطر نے بھی آنا چھوڑ دیا ہے۔ یہ کس کی جستجو ہے جو شبانہ روز جاری ہے۔ ایک عالمِ دیوانگی مستولی ہے جو ہر طرف گھمائے پھرائے رکھتا ہے۔ تنہائیوں کا باعث دلدارِ غفلت شعار ہے حالانکہ تمام تر خواہشات اسی سے وابستہ ہیں۔ ایک عرصہ ہوا کہ وہ واپس نہیں آیا۔ حالانکہ وہی پری جمال ہی میرے دل کا سہارا ہے۔

اس کے غمِ جدائی نے اس قدر ہلکان کر دیا ہے کہ اب تو دنیا کی رعنائیاں بھی بے معانی ہو کر رہ گئی ہیں۔ میں نے اسے پانے کے لیے کیا کیا دوڑ دھوپ نہیں کی۔ قریہ قریہ پھرا ہوں۔ مگر ملاپ نہیں ہو پایا۔ کاش اسے عہدِ وفا یاد آ جاتا۔ وہ ملاقاتیں وہ باتیں جو اس سے ہوتی رہی تھیں، کاش ایک بار اسے پھر یاد آئیں۔

اس نظم میں استفہامیہ فضا قائم کی گئی ہے۔ اندازِ بیاں بہت پرسوز اور خشک محبت سے لبریز ہے۔ ایک سنگ دل محبوب اور ایک جانثار عاشق کے درمیان جو معاشرتی تفاعل ظہور پذیر ہوتا ہے، اس کی بھرپور عکاسی اس نظم میں پائی جاتی ہے۔ بقول کسے:

ان کے لیے ہے آسماں، جائیں گے ہم وہاں کہاں؟
اپنے لیے بنی زمیں، آئیں گے وہ یہاں کہاں؟

محبت کی روش برقرار ہے۔ رنگِ خلوص چوکھا ہے مگر اس بار پچھتاوے کے رنگ میں ہے۔ جی ہاں! پروفیسر ظہور احمد فاتح کی نظم ''پچھتاوا'' کے عنوان سے ہمارے روبرو ایستادہ ہے۔ کتاب کا نام ہے ''چہرۂ ہستی''۔ اس کتاب سے ایک شعر ملاحظہ ہو:

دیکھی ہیں جب سے چہرۂ ہستی کی وحشتیں
روئے نگارِ مرگ ہی سندر لگا ہمیں

اب ہم نظم لکھتے ہیں:

کیا خبر تھی کہ تری بزم سے جانا ہو گا؟
ہجر کا زہر بھی اک دن مجھے کھانا ہو گا
میں تصور بھی نہ کر سکتا تھا اک دن مجھ کو
حالِ دل رو کے زمانے کو سنانا ہو گا
میں نے سوچا بھی نہ تھا موت کے ارماں ہوں گے
زندگی میں کبھی اس موڑ پہ آنا ہو گا
میں تھا لاعلم کہ یوں آتشِ ہجراں میں کبھی
دلِ مجبور کو ہر وقت جلانا ہو گا
کیسے میں جانتا اے دوست بچھڑ کر تجھ سے؟
رات دن شام و سحر اشک بہانا ہو گا

نہ تھا معلوم کہ شدت سے تڑپ جاؤں گا
دل کے جذبے کو کبھی ایسے دبانا ہو گا
یہ گماں تک بھی نہ ہوتا تھا کہ اک دن فاتح
اپنی ناکامی پہ دنیا کو ہنسانا ہو گا

(صفحہ:106 تا 108)

ابوالبیان ظہور احمد فاتح کی یہ نظم احساسِ ندامت سے معمور ہے۔کیا سوچا تھا، کیا ہو گیا؟ کیا چاہا تھا، کیا پایا؟ یہ تو کبھی خیال ہی نہیں آیا تھا کہ ایک دن بزمِ جاناں کو چھوڑنا ہو گا۔ یہ تو گمان بھی نہیں کیا تھا کہ کسی وقت زہرِ ہجراں بھی پھانکنا پڑے گا۔ یہ ات تو کبھی حاشیۂ تصور میں بھی نہیں آئی تھی کہ ہمیشہ خوشحال و مسرور رہنے والا انسان اپنی سرگزشت رو رو کر اہلِ دنیا کو سناتا پھرے گا۔ کبھی اس پر غور ہی نہیں کیا تھا کہ محبت اس موڑ پر لائے گی کہ آدمی مرنے کی آرزو کرے گا۔ کسے علم تھا کہ آتشِ ہجراں یوں شعلہ بار ہو جائے گی کہ قلب و جان و جگر کو بھسم کر ڈالے گی۔ مطلق خبر نہ تھی کہ تجھ سے بچھڑ کر صبح و مسا اشک ریزیوں سے پالا پڑے گا۔ یہ بات تو کبھی گوشۂ فکر تک ہی نہیں پہنچی تھی کہ جذبات کو دباتے دباتے خود مجھے مرغِ بسمل بننا ہو گا۔ ان تمام عذابات پر طرہ شماتتِ اعدا ہے۔ آج میں رو رہا ہوں اور حریف میری حالت پر خندہ زن ہیں کہ ایک فاتح مفتوح ہو کر رہ گیا ہے۔

اس نظم میں ایک گہرا سماجی احساس کارفرما ہے جو جذبۂ محبت کی پیداوار ہے۔ گویا تفاعلِ الفت یک طرفہ رہا ہے۔ عاشق اپنے جذبۂ بیدار کے ہاتھوں مجبور ہے جبکہ محبوب ہنوز محوِ تغافل ہے۔ سب کچھ خلافِ توقع ہو گیا ہے۔ گویا بساطِ شوق الٹ گئی ہے۔ وہ جو کامیابیوں پر کامیابیاں حاصل کر رہا تھا۔ اس کی فتوحاتِ عشق کا سلسلہ نہ صرف موقوف ہو گیا بلکہ نوبت بہ ایں جا رسید کہ اب ناکامیوں سے دو چار ہو گیا ہے۔ محرومیوں کی آماجگاہ بن گیا ہے۔ مایوسیوں نے ڈیرے ڈال رکھے ہیں۔ اداسیاں ایک ایسے مہمان کی طرح براجمان ہو گئی ہیں کہ جانے کا نام ہی نہیں لے رہیں۔ ایسے میں دعا ہی کی جاسکتی ہے۔

مریضِ عشق پر رحمت خدا کی
مرض بڑھتا گیا جوں جوں دعا کی

مندرجہ بالا استشہادات سے یہ امر پایۂ ثبوت کو پہنچتا ہے کہ جنابِ فاتح کے ہاں ایک زبردست سماجی شعور موجزن ہے۔ عمرانی ادراکات کا ایک لامتناہی سلسلہ ان کے فحوائے سخن کی جان ہے جس میں ہر

طرح کے معاشرتی افکار جاگزیں ہیں۔انفرادی حوالے بھی ہیں۔غمِ جاناں بھی ہے اور غمِ روزگار بھی۔ایسا سخن ور ایک زندہ جاوید شاعر ہوتا ہے جو زمانی و مکانی قیود سے آزاد ہوتا ہے جس کی شاعری آفاقی پہلو رکھتی ہے اور جس کے تخیلات اعماقی انداز کے حامل ہوتے ہیں۔

ابوالبیان ظہور احمد فاتح کے سخن میں نفسیاتی امکانات

ہمارے معاشرتی علوم میں علمِ نفسیات خاص اہمیت رکھتا ہے جو تحت الشعور، لاشعور اور شعور کے گرد گھومتا ہے۔ ہم تحلیلِ نفسی کے ذریعے نفسیاتی اسقام تک پہنچ سکتے ہیں۔ شاعری کتھارسس کا شاندار ذریعہ ہے جو ازالہء رنج کی ایک موثر صورت ہے۔ شعر و ادب میں نفسیاتی حوالوں کو وقیع سمجھا جاتا ہے اور باضابطہ طور پر ان کا جائزہ لیا جاتا ہے۔ اس جہت کو عرفِ عام میں نفسیاتی تنقید کہا جاتا ہے جس کا شمار تنقید کے جدید دبستانوں میں ہوتا ہے۔ معروف مغربی نقاد ہومر اور فرائیڈ اس دبستان کے متقدمین میں شمار کیے جاتے ہیں۔

اگر ہم ابوالبیان ظہور احمد فاتح کے تعلیمِ سخن میں غوطہ زن ہوں تو بے شمار نفسیاتی امکانات جھانکتے ہوئے محسوس ہوتے ہیں۔ ذیل میں ہم ان کے کلام میں سے چند ایسے استشہادات لا رہے ہیں۔ جنہیں پڑھ کر ان کے نفسیاتی تجرِ دانش کا اندازہ بہ حسن و خوبی لگایا جا سکتا ہے۔

اس وقت ان کی ایک نظم بعنوان ''امتحانِ عشق'' ہمارے سامنے ہے جو مجموعہء کلام ''تصویرِ کائنات'' مطبوعہ 2013ء میں شامل ہے۔ یہ نظم محبت کی نفسیاتی احاطہ بندی کرتی ہے۔ محب کے نفسیاتی ادراکات نیز ایک محبوب کی ذہنی کیفیات پر روشنی ڈالتی ہے۔ نظم یہاں رقم کی جارہی ہے۔

اپنی نظریں میری نظروں سے ملا کے دیکھ لو
پھر مری کیفیتیں نزدیک آ کے دیکھ لو
پھول کی صورت لگے کھلنے میرا غمگین دل

ایک لمحہ میرے پیارے مسکرا کے دیکھ لو
ہاں محبت دردِ دل ہے ایک شیریں سوز ہے
بحرِ الفت میں ذرا غوطہ لگا کے دیکھ لو
خواہ مخواہ مجھ باوفا کو بے وفا سمجھے ہو تم
جی اگر چاہے تمہارا آزما کے دیکھ لو
کتنی الفت ہے مرے دل میں تمہارے واسطے
میرا دل احساس کا چشمہ لگا کے دیکھ لو
میں نے کی تم سے محبت ایک شاعر بن گیا
میری الفت بھی ذرا دل میں بٹھا کے دیکھ لو
ہاں مرے پیارے ترا فاتح پرانا رند ہے
جام صہبائے محبت کا پلا کے دیکھ لو

(صفحہ:88-89)

عجیب نفسیاتی کیفیات کی حامل یہ نظم ہے جس میں طرح طرح کے تجارب ہویدا ہوئے ہیں۔ نظروں کا اتصالِ نظر، کیفیتِ قرب، شگفتِ دلِ غمگیں، تاثرِ تبسم، محبت کی درد آمیزی، سوزِ شیریں، بحرِ الفت میں غوطہ زنی، سوئےظن، آزمائش، معائنۂ عالم، اثراتِ محبت، شاعرگری، دعوتِ الفت، اعترافِ رندی اور مطالبۂ صہبائے عشق یہ ایسے عناصر ہیں جن کی نوعیات ایک اہلِ دل ہی سمجھ سکتا ہے۔

آگے چلتے ہیں تو ایک اور نظم ''وصلِ عارضی'' کے سرنامے سے مزین مشمولہ ''تصویرِ کائنات'' دامن کش ہوتی ہے۔ یہ نظم بھی نفسیاتِ محبت کے مختلف امکانات خود میں سموئے ہوئے ہے۔ ذیل میں ہم یہ نظم درج کیے دیتے ہیں۔ دیدہ باید کس حد تک چشمِ قاری کارگر ثابت ہوتی ہے۔

ظلمت کدے میں چاند آیا آ کے چل دیا
پھر سے سیہ قبا مجھے پہنا کے چل دیا
بن کے مسیح آیا تھا مجھ کو سنبھالنے
میرا مرض کمال کو پہنچا کے چل دیا
آیا تو تھا سکون کے سامان لیے ہوئے
دل کو مرے وہ اور بھی تڑپا کے چل دیا

دھیرے سے دل میں آگ سلگتی تھی پیار کی
وہ شوخ اس کو ایک دم بھڑکا کے چل دیا
ساقی نے ظلم فاتحِ نو نوش پر کیا
اس کو نگاہِ مست سے بہکا کے چل دیا

(صفحہ:94)

اہلِ دل محبت کے پیاسے ہوتے ہیں۔ان کا منتہائے مقصود وصالِ محبوب ہوتا ہے اور وہ چاہتے ہیں کہ محبوب ہمیشہ ساتھ رہے۔

اگرچہ محبوب کا آ جانا ان کے لیے کسی عید سے کم نہیں مگر وہ نفسیاتی طور پر اس قدر پیاس لیے ہوئے ہوتے ہیں کہ اس ہنگامی وصال کو وصلِ عارضی کا نام دیتے ہیں۔یہی تاثر نظمِ ہزا لیے ہوئے ہے کہ ہمارے سیاہ خانے میں چاند آیا بھی مگر آ کر چلا گیا۔اس کا واپس چلے جانا گویا ازسرِ نو قبائے ظلمت پہنانے کے مترادف ہے۔محبوب دل شکستہ کا مسیحا ہے۔اس کا ارادہ تو مسیحائی کرنے کا تھا مگر افسوس صد افسوس وہ لاشعوری طور پر میرے روگ میں اضافہ کر گیا ہے۔وہ اگرچہ بزعمِ خویش سامانِ سکوں لے کر آیا تھا مگر حقیقتاً ہوا یوں کہ اس کے باعث میری بے قراریاں اور بڑھ گئیں۔اس میں کوئی شک نہیں کہ دل میں پیار کی آتشِ خاموش دہک رہی تھی مگر اس شوخ نے ایک دم اسے شعلہ بار کر دیا۔اس میں کوئی شک نہیں کہ اس کے تھوڑی دیر آ کر چلے جانے سے غمِ ہجر اور بڑھ گیا۔اس کا ایک نفسیاتی فائدہ یہ بھی ہوا کہ اس نے سوزِ عشق سے دل کو گرما دیا۔فاتح ساغرِ شوق نوش کرنے لگا تھا مگر ساقیِٔ گلفام نے ایک دم اتنی مے پلا دی کہ وہ نشۂ عشق میں بہکنے لگا۔

یہ نظم عجیب امکاناتِ نفسیات کو دمیں سموئے ہوئے ہے جن کا استحضار صرف اس شخص کو ہوسکتا ہے جو بحرِ عشق کا غوطہ زن ہو چکا ہو۔یہ نو واردانِ محبت کے لیے پیشگی اطلاع کا درجہ رکھتی ہے کہ یہ اور یہ مراحل پیش آسکتے ہیں اور ایسی ایسی کیفیتوں کا سامنا ہوسکتا ہے۔غم سے خوشی اور خوشی سے غم کا پہلو نکل سکتا ہے۔

اب ایک اور نظم توجہ اپنی طرف مبذول کرا رہی ہے جس میں آمدِ یار کی تہنیت کے نفسیاتی اثرات نمایاں ہیں جو نویدِ جانفزا کا درجہ رکھتے ہیں۔ذیل میں ہم وہ نظم قلم بند کیے دیتے ہیں جو بعنوان ''مرحبا'' ان کی کتاب ''تصویرِ کائنات'' میں شامل ہے:

گھر میرے وہ پیکرِ حسن و جمال آ ہی گیا
لے کے آرامِ دل افسردہ حال آ ہی گیا

ہوگئیں تھیں جس کی فرقت میں مری نیندیں اچاٹ
وہ حبیبِ خوش ادا و خوش فعال آ ہی گیا
ہم جسے کہتے تھے ظالم بے مروت سنگدل
اپنے عاشق کا اسے آخر خیال آ ہی گیا
تھی فقط یارِ کرشمہ ساز کے آنے کی دیر
دل کی بے تابی میں فوراً اعتدال آ ہی گیا
کٹ گئی وہ ہجر کی طولانی و تاریک رات
راحت و تسکیں لیے یومِ وصال آ ہی گیا
سن کے نغمے پیار کے اس غیرتِ ناہید سے
درد سے سہمے ہوئے دل کو بھی تال آ ہی گیا

(صفحہ:96)

ایک جذبہ، ایک آہنگ اور ایک مژدہ ءسرور کا عالم ہے جو اس نظم میں کارفرما ہے۔ محبوبِ جاں نواز میرے گھر میں آ گیا ہے۔ اداس حال، دل کے لیے دوائے درماندگی ساتھ لایا ہے۔ جس کے فراق میں میری نیندیں اڑ گئی تھیں۔ وہ محبوبِ خوش ادا تشریف لے آیا ہے۔ وہ دلبر جسے ہم کبھی کٹھور دل کہتے تھے، کبھی بے وفا و بے مروت گردانتے تھے، کتنی اچھی بات ہے کہ سے اپنے عاشق کا خود ہی خیال آ گیا ہے۔ بس اس کے آنے کی دیر تھی کہ سارے دکھ ٹل گئے۔ پریشانیاں دور ہوگئیں۔ یہاں تک کہ بے ربط دھڑکنوں میں بھی اعتدال پیدا ہوگیا ہے۔ جدائی کی اندھیری شب تمام ہوئی تو گویا وصال کا یہ دن تسکین و راحت کا پیغام لایا ہے۔ اس نے آتے ہی نغماتِ محبت چھیڑ دیے۔ پھر کیا تھا یہ دل جو شدتِ درد سے سہم چکا تھا، عالمِ وجد میں رقصاں نظر آنے لگا۔

یہ نظم بھی نفسیاتِ شوق سے لبریز ہے۔ بھرپور رومانی فضا کارفرما ہے۔ اس میں طربیہ اور رجائی امکانات بھی پورے طور پر موجزن ہیں۔ نظمِ ھٰذا وسیع تر لسانی استخدام اور عمیق تجربات کی حامل ہے۔

مزید پیش رفت کیجیے تو نظم ''الوداع میرے سکول'' شاملِ شذرہ ہے جو مجموعہ کلام ''چہرہ ءہستی'' سے لی گئی ہے:

اے مرے سکول میری درس گاہِ ذی وقار
تیری یادیں ہیں حسیں اور احساں بے شمار

کر رہا ہے مدتوں سے تو اشاعت علم کی
دے رہا ہے علم کے پیاسوں کو دولت علم کی
تیری ان فیاضیوں کا میں بہت ممنون ہوں
حق تو یہ ہے تیرے احسانات کا مرہون ہوں
میں رہا گل کی طرح تیرے چمن میں اے سکول
میں نے تجھ سے ہی کیا ہے علم و دانش کا حصول
ایچ نما صورت تری جب بھی مجھے یاد آئے گی
تجھ میں جو دن ہیں گزارے ان کی یاد آ جائے گی
یاد آئے گا مجھے اسٹاف تیرا بار بار
تیرا گلشن اور یہ تیری فضائے خوشگوار
ہوسٹل یہ ہال یہ مسجد یہ تیری ورکشاپ
جب بھی یاد آئیں گے بیٹھوں گا ترے نغمے الاپ
جانِ فاتح آج کہنا پڑ رہا ہے الوداع
سر پہ آخر وقتِ رخصت آ گیا ہے الوداع

(صفحہ:73-74)

ایک انسان کی ابتدائی ترین نفسیاتی وابستگی یا اس کے گھر سے ہوتی ہے جہاں وہ اپنے لیل ونہار گزارتا ہے یا پھر اس درس گاہ سے ہوتی ہے جہاں سے حصولِ علم و دانش کرتا ہے۔ نظمِ ھٰذا ابوالبیان ظہور احمد فاتح کی اپنے تعلیمی ادارے سے عمیق نفسیاتی تعلق کی غماز ہے۔ اس مدرسے میں اس کے اساتذہ ہیں۔ اس کے ہم جماعت ہیں اور اس کے عزیز دوست احباب ہیں۔ اس کی نصابی و ہم نصابی سرگرمیاں ہیں۔ اس کے نت نئے اسباق ہیں۔ اس کی یادیں ہیں جنہیں وہ سینے سے لگائے پھرتا ہے۔ ان کی یہ نظم بھی شدید نفسیاتی تعلق خاطر پر روشنی ڈالتی ہے۔ چنانچہ وہ کہتے ہیں کہ اے میری پیاری درس گاہ تو میرے لیے ناقابلِ فراموش ہے۔ اے میرے سکول میں تیرا مرہونِ منت ہوں کہ مجھ پر تیرے لاتعداد احسانات ہیں۔ تو نے ایک بچے کو تعلیم یافتہ بنا دیا۔ ایک غنچۂ گل کی طرح مہکتا رہا میرے لیے یہ امر باعثِ نازش ہے اے میرے سکول تیرا ایچ نما نقشہ جب بھی کبھی میں دیکھتا ہوں تو تجھ میں گزارے ہوئے شب و روز یاد آ جاتے ہیں۔ تیرا یہ اسٹاف جو اتنا مونس و مہربان ہے، مجھے ہر گاہ یاد آئے گا اور میرے

اسکول یہ میرے کمرے، یہ ہوسٹل، یہ ہال، یہ مسجد اور یہ ورکشاپ غرض سارے مقامات مجھے اچھی طرح یاد ہیں۔ میں تیرے تصورات میں کھویا رہوں گا اور تیری یاد میں اشعار کہتا رہوں گا۔ یہ تیری محبت کا مظہر ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آج مجھے الوداع کہتے ہوئے بڑا دکھ ہو رہا ہے اور یہ دکھ جانے کا نہیں بلکہ ہمیشہ میرے دل میں جاگزیں رہے گا۔ یہ نظم صرف نفسیاتی وابستگی کی مظہر نہیں بلکہ اس میں گہرے احساسات، کیفیاتِ تخاطب، منظر نگاری اور تاثر نگاری کی عمیق پرتیں خود میں لیے ہوئے ہے۔

ایک سچا سخن ور صرف ذاتی احساسات کا حامل نہیں ہوتا بلکہ وہ غمِ جہاں کو خود پر اوڑھنے کا قرینہ رکھتا ہے۔ وہ جگ بیتی کو آپ بیتی بنالیتا ہے۔ اہلِ عالم کی نفسیاتی کیفیات کو اپنی ہی نفسیاتی وجذباتی واردات سمجھتا ہے۔ نظم ''ایک خاوند ستائی خدا کے حضور میں خود کشی سے پہلے'' نفسیاتی فضا کی مظہر ہے۔ اس کا ظالم شوہر اس سے جو جو بدسلوکیاں کرتا ہے اور جن جن جابرانہ ہتھکنڈوں سے اس کے پندارِ ذات کو ملیا میٹ کرتا ہے اور جس جس طرح اس کے شعور کی دھجیاں اڑاتا ہے، یہاں تک کہ وہ خود کشی پر مجبور ہو جاتی ہے، یہ نظم ان تمام تر ذہنی ادراکات کی مظہر ہے جو اس کی خود کشی میں بنیادی عوامل کا کردار ادا کرتے ہی۔ نظم ہدیۂ قارئین ہے:

یہ تری دنیا ہے یا یہ کارگاہِ درد ہے
ہر طرف چھائی ہوئی ظلم و ستم کی گرد ہے
جذبۂ جور و جفا ہے اس قدر کیوں مشتعل؟
جذبۂ مہر و محبت اس قدر کیوں سرد ہے؟
کیوں غضب کی آگ میں انساں کی آنکھیں سرخ ہیں؟
کیوں جفا کے خوف سے انساں کا چہرہ زرد ہے؟
نرم دل کمزور عورت پر ستم ڈھاتا ہے کیوں؟
اے مرے اللہ اتنا سنگ دل کیوں مرد ہے؟
کیوں بسا رکھا ہے تو نے آج تک مولا اسے؟
تیرا نافرمان جس دنیا کا ہر اک فرد ہے
خوفِ گستاخی سے میں کچھ اور کہہ سکتی نہیں
ایسی دنیا میں تری میں زندہ رہ سکتی نہیں
جان میں جب تک سکت تھی میں نے سب کچھ سہہ لیا

اب زیادہ ظلم و درد و رنج سہہ سکتی نہیں

(صفحہ:76-77)

اس نظم میں شوہر کی ستم رسیدہ خاتون قبل از خودکشی اپنے مالکِ حقیقی سے شکوہ کناں ہے کہ یارب! یہ تیری دنیا ہے کا کارخانۂ رنج ومحن ہے جس میں چارسو جور و جفا کی گرد پھیلی ہوئی ہے۔ مجھے حیرت ہے کہ لوگ ظلم وستم پر اس قدر کیوں کمر بستہ ہیں جبکہ پیار ومحبت کا جذبہ نہ ہونے کے برابر ہے۔عصرِ حاضر کا انسان ہر وقت قہرمان وغضب ناک ہے اور غصے کی وجہ سے اس کی آنکھیں سرخ رہتی ہیں اور وہ بھی انسان ہیں جن کے چہرے مارے خوف کے زرد رہتے ہیں۔مرد کا حال یہ ہے کہ سفاک بنا ہوا ہے اور کمزور و نرم دل عورت پر ظلم ڈھاتا رہتا ہے۔ اس سے اسے نہ جانے کیا حاصل ہوتا ہے۔اے اللہ! ایسی دنیا کو آباد رکھنے کی ضرورت ہی کیا ہے جہاں ہر شخص تیری نافرمانی اور تیری مخلوق کو ستانے پر تلا ہوا ہے۔ بقول ظفرؔ:

روز معمورۂ ہستی میں خرابی ہے ظفرؔ

ایسی ہستی کو تو ویرانہ بنایا ہوتا

اے مالکِ دو جہاں! میں ڈرتی ہوں کہ کہیں فرطِ رنج سے کوئی کلمۂ بے ادبی میری زبان پر نہ آجائے، میں اپنی فریاد یہیں تمام کرتی ہوں اور حاصلِ کلام یہ ہے کہ ناراضی معاف میں تیری ایسی سنگ دل دنیا میں زندہ نہیں رہ سکتی۔ لہٰذا مجبوراً اقدامِ خودکشی کر رہی ہوں۔ اے مالکِ حقیقی! جب تک میری قوتِ برداشت کام کرتی تھی، میں نے ہر ظلم وستم، ہر جور سہہ لیا۔ اب میری برداشت جواب دے چکی ہے۔ لہٰذا اس سے زیادہ رنج والم سہنے کی سکت خود میں نہیں رکھتی۔ یہی وجہ ہے کہ جانِ عزیز کو موت کی آغوش میں دھکیل رہی ہوں۔

اس نظم میں گہرے نفسیاتی اضطراب کی بازگشت سنائی دیتی ہے۔اس میں وہ عصری رویہ جو ہر دور میں کسی نہ کسی صورت میں کارفرما رہا ہے، پوری طرح سایہ فگن ہے۔ وہ نفسیاتی اثرات جو درد کے ماروں کے ہاں بکثرت پائے جاتے ہیں، اس نظم میں بدرجہ اتم موجود ہیں۔ کئی نفسیاتی امکانات مثلاً ظلم و بیداد، کسمپرسی، مظلومیت، مردانہ سماج، ضعفِ نسواں، معاشرتی بے حسی، قانون سے بے خوفی، مجرم نوازی کے جملہ نفسیاتی عواقب اقدامِ خودکشی اس کے لوازم وعوارض، لاشعور، تحت الشعور کی کشمکش آخرش فرطِ غم ویاس کی جیت اور انسانی زندگی کا خاتمہ۔ یہ ہے اس نظم کی سائیکی جو ایک باشعور اور باضمیر انسان کو جھنجھوڑ کر رکھتی ہے۔ نفسیاتی کیفیات کے ساتھ ساتھ نظم ھذا ایک واقعاتی اور وارداتی حوالے کا درجہ رکھتی ہے۔ جس کے ڈانڈے عصری رویوں اور انسانی حماقتوں سے جا ملتے ہیں۔ اسے ہم حقوقِ نسواں کے لیے ایک بالواسطہ

احتجاج بھی قرار دے سکتے ہیں۔ اسے ہم ذہنی بیداری اور عصری آموزش کا ایک کارنامہ بھی سمجھ سکتے ہیں۔

ایک سچا اور اچھا شاعر ہر طرح کے مضامین سے انصاف کرنے کا جوہر خود میں رکھتا ہے۔ وہ ایسے اچھوتے اور بظاہر نا قابلِ اعتنا موضوعات کو بھی احاطۂ بیان میں لے آتا ہے جس پر انسان داد دیے بغیر نہیں رہ سکتا۔ یہاں ایک نظم بعنوان ''بستر'' دامنِ توجہ اپنی طرف مبذول کرا رہی ہے:

مرا بستر مرے خوابوں کی پراسرار دنیا ہے
بہت پر کیف دنیا ہے بڑی دل دار دنیا ہے
کسی کے جسم کی نرمی ہے نرمی میرے بستر کی
کسی کے سانس کی گرمی ہے گرمی میرے بستر کی
میں دن بھر کی تگ و دو کا تھکا ہارا جو آتا ہوں
میں اس میں لیٹ جاتا ہوں بہت آرام پاتا ہوں
کبھی دن کو پریشانی کا ہالہ گھیر لیتا ہے
تو میرا جاں فزا بستر مجھے تسکین دیتا ہے
مجھے بستر میں اپنے ایسی میٹھی نیند آتی ہے
دلِ پر درد کو دنیا کی کلفت بھول جاتی ہے
مری وہ خواہشیں جو وقتِ بیداری ستاتی ہیں
مرے خوابوں کی اس فردوس میں تسکین پاتی ہیں
کبھی میں سوچتا ہوں گر نہ ہوتا یہ مرا بستر
تو پا سکتا یہ آرام و سکون و کیف میں کیونکر
مگر پھر عقل ان کے حال پر بھی غور کرتی ہے
وہ بے چارے کہ جن کی رات بے بستر گزرتی ہے
دعا آتی ہے لب پر ہر بشر کے پاس بستر ہو
خداوندا! یہ آرام و سکوں سب کو میسر ہو

(''چہرۂ ہستی''۔ صفحہ 77-78)

ایسا لگتا ہے کہ ابوالبیان ظہور احمد فاتح بستر سے بھی خاصی نفسیاتی وابستگی رکھتے ہیں اور اس کی ایک

معقول وجہ بھی ہے کہ وہ عذرِ بصارت کے باعث زیادہ تر گھر میں ہی رہتے ہیں اور ان کا اکثر و بیشتر وقت بستر میں ہی گزرتا ہے اور وہ جو مثل مشہور ہے کہ جس کے ساتھ زیادہ وقت گزرتا ہے، اس کی چاہت بھی بڑھ جاتی ہے کیونکہ انسان اس سے فطری طور پر کافی مانوس ہو جاتا ہے۔ چنانچہ وہ بڑی رغبت سے کہتے ہیں کہ میرا بستر مرے خوابوں کی پر اسرار جنت ہے۔ یہ ایک ایسی دنیا ہے جس میں کیف و سرور ہے۔ دلداری ہے، دل نوازی ہے۔ میرے بستر کا گداز جسمِ یار کے گداز کی طرح ہے۔ اس میں تمام وہی نرمی و گرمی پائی جاتی ہے جو وجودِ یار کا خاصا ہے۔ میرے بستر میں یہ خوبی ہے کہ جب میں سارے دن کی دوڑ دھوپ کے بعد واپس اس میں آتا ہوں تو ایسا سکون پاتا ہوں کہ ساری تھکان جاتی رہتی ہے۔ کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ کوئی پریشانی ستانے لگتی ہے تو یہ میرا بستر ہی ہے جو مجھے سکون فراہم کرتا ہے۔ مجھے اپنے بستر میں خوابِ شیریں کے مزے ملتے ہیں اور میں دنیا بھر کے غم بھول جاتا ہوں۔ ایسی خواہشیں جو بحالتِ بیداری تنگ کرتی ہیں، جب میں اپنے بستر میں خوابِ خرگوش کے مزے لینے لگتا ہوں تو میری ان خواہشات کو سکون ملتا ہے اور میری ان پریشانیوں کا کتھارسز ہو جاتا ہے۔ اگر میرا یہ بستر نہ ہوتا تو مجھے یہ سکھ سکون اور آرام کیسے ملتا؟ ایسے میں میرا ذہن ان لوگوں کی طرف منعکس ہو جاتا ہے جنہیں کوئی بستر میسر نہیں ہوتا اور جن کی رات بستر کے بغیر گزرتی ہے۔ ایسے میں میرے لب پر دعا آتی ہے کہ اے مالک القیوم ہر شخص کو بستر عطا فرمانا کہ یہ لازمۂ حیات ہے۔ یہ سکھ سکون کی کائنات ہے۔ یہ راحتوں کی بارات ہے اور نفسیاتی وابستگی پورے طور پر اس کے ساتھ ہے۔

اگر بستر جنابِ فاتح کے لیے باعثِ راحت و تسکین ہے تو انھوں نے اس نظم میں بستر کا ایسا خوب صورت قصیدہ کہا ہے کہ گویا نوازشِ بستر کا حق ادا کر دیا ہے۔ ایسی جزئیات نگاری کی ہے اور ایسی حقائق بیانی سے کام لیا ہے کہ طبیعت باغ و بہار ہو جاتی ہے۔ یہ یقیناً ایک قادرالکلام شاعر کا کرشمۂ ہنر ہے۔

سیانے کہہ گئے ہیں کہ عشق دیوانگی ہے۔ جس طرح ایک دیوانے کا حال ناقابلِ فہم ہوتا ہے، اسی طرح ایک عاشق کی حالت بھی بعید از قیاس ہوتی ہے۔ طبیعت کی اس بوالعجبی کا اظہار اس نظم بعنوان ’’ناقابلِ فہم‘‘، مشمولہ ’’چہرۂ ہستی‘‘ میں کیا گیا ہے:

کبھی ہے مجھ کو ترے لطف و کرم کی خواہش
ہے کبھی جدتِ اندازِ ستم کی خواہش
کبھی ہے تیرے نہ آنے کی شکایت مجھ کو
ہے کبھی تیری جدائی کے الم کی خواہش

جانتا ہوں میں کبھی ناز تری غفلت کو
او کبھی تجھ سے ہے اک جذبِ اتم کی خواہش
دل اگرچہ میرا صد چاک ہے میرے پیارے
پھر بھی ہے اس کو تری تیغ دو دم کی خواہش
کارفرما ہے کبھی عشقِ خدا کا جذبہ
ہے کبھی دل میں مرے وصلِ صنم کی خواہش
آہ ناقابلِ تفہیم ہے دل کی حالت
ہے مسرت کی تمنا کبھی غم کی کواہش
میں کبھی عالمِ رنگیں کا ہوں شائق فاتح
ہے کبھی دل میں مرے راہِ عدم کی خواہش

(''چہرۂ ہستی''۔صفحہ 84-85)

ابوالبیان ظہور احمد فاتح دیارِ دل میں پائی جانے والی نفسیاتی کشاکش کو ناقابلِ فہم قرار دیتے ہیں۔ رقم طراز ہیں کہ میرے دروں میں عجیب متضاد خواہشات موجزن ہیں۔کبھی میں چاہتا ہوں کہ تیرالطف و کرم شاملِ حال رہے۔کبھی تمنا جاگتی ہے کہ تیرے اندازِ ستم میں ہر بار ایک نیا پن پیدا ہو۔کبھی شکوہ کناں ہو کہ تو مجھ سے ملنے کیوں نہیں آتا؟ پھر کبھی درد ِجدائی سے دوچار ہونا چاہتا ہوں۔ میں کبھی تو تیرے طرزِ تغافل کو ناز نخرے کا نام دیتا ہوں اور کبھی یہ آرزو پیدا ہوتی ہے کہ ہم ایک دوسرے میں جذب و مدغم ہو جائیں۔ اگرچہ میرا دل چاک چاک ہوا جاتا ہے پھر بھی یہ چاہتا ہے کہ تیری دو دھاری تلواری یونہی چلتی رہے۔اپنا یہ عالم ہے کہ کبھی تو خدا سے لو لگا لیتا ہوں اور کبھی وصالِ صنم کا آرزومند ہو جاتا ہوں۔اس طرح ایک غزل میں بھی کہتے ہیں:

جنوں ایسا ہوا مجھ چودھویں صدی کے مسلم کو
کبھی مسجد کو اپنایا کبھی کوئے بتاں میں نے

چنانچہ ان کا خیال ہے کہ دل کی حالت ناقابلِ فہم ہے۔ایک دوسرے کے برعکس مطالبات کرتا رہتا ہے۔گاہِ مسرت کا طالب ہوتا ہے۔گاہِ غم کا تمنائی ہو جاتا ہے۔اپنی یہ تضادی آمیز کیفیت مجھے حیران کر دیتی ہے کہ کبھی تو ایک رنگین زندگی کے خواب دیکھنے لگتا ہے اور کبھی فکرِ عدم سادگی اور ترکِ لذت پر مجبور کر دیتی ہے۔

غرض یہ نظم بھی خود میں گنگا جمنی نفسیاتی کیفیات رکھتی ہے جس کی تفہیم خود شاعر کے لیے ایک مسئلہ بنی ہوئی ہے۔ دل کے متضاد مطالبات حیران کن ہیں۔ اس کی متنوع کیفیات اور گونا گوں واردات دیوان بنائے جا رہی ہے۔ سمجھ میں کچھ نہیں آتا کہ ایں نفسیات چہ معنی دارد؟

دورانِ مطالعہ ابو البیان ظہور احمد فاتح کی ایک اور نظم معنون بہ ''آہنگِ خلوص'' دامنِ توجہ کھینچ لیتی ہے۔ یہ نظم ان کی کتابِ شعر ''چہرۂ ہستی'' کا جزوِ روشن ہے۔ یہ نظم بھی بڑا دل نواز نفسیاتی ماحول بنائے ہوئے ہے۔ انسانی خواہشات کا محور اس کا دل ہوتا ہے اور قلبی کیفیات کا نقطۂ پرکار خلوص ہوتا ہے۔ یہ نظم بھی خلوص کے گرد طواف کرتی ہے جس میں تحلیلِ نفسی کے بے شمار قرینے پائے جاتے ہیں۔ پہلے نظم ملاحظہ کریں:

دیکھ لے اے پیکرِ حسن و ادا میرا خلوص
دے رہا ہے دعوتِ مہر و وفا میرا خلوص
اب تو کہہ لیتے ہو تم اس کو تصنع جانِ من
دیکھ لینا یاد آئے گا سدا میرا خلوص
کثرتِ درد و الم سے حال پتلا ہے مرا
پر نہیں شاکی تمہارے جور کا میرا خلوص
باوجودِ بے رخی ہوتا نہیں چیں بہ چیں
ہم نشیں ہے کتنا رفعت آشنا میرا خلوص؟
آہ فاتح ایک مدت سے ہے میرے واسطے
وجہِ رنج و درد و کرب و ابتلا میرا خلوص

(صفحہ: 86-87)

شاعر محبوبِ جانفزا سے مخاطب ہے اور دعوت دے رہا ہے کہ اے سراپا ناز و اداذرا میرا خلوص بھی دیکھ لے کہ کیسے تجھے ٹوٹ کر چاہتا ہوں اور اس خلوصِ والہانہ کا یہ تقاضا ہے کہ جواباً! مجھ سے بھی محبت کی جائے۔

تو ہے تشنۂ محبت میں ہوں بحرِ عشق فاتح
آ تجھے گلے لگا کے تیری تشنگی بجھا دوں

ٹھیک ہے تم اب تو بناوٹی کہتے ہوئے میرے مخلصانہ خیالات کا مذاق اڑاتے ہو لیکن ایک دن ہمارا

یہ خلوص ضرور یاد آئے گا۔ اگرچہ وفورِ رنج وسوز نے مجھے بے حال کر رکھا ہے لیکن اپنے خلوص کا یہ عالم ہے کہ محبوب کے کسی جور و جفا پر کسی گلے شکوے کا روادار نہیں۔ میرا خلوص رائیگاں جانے والا نہیں ہے۔ یہ ضرور ایک دن تیرے دل پر اثر انداز ہو گا اور اسے پگھلا کر موم بنا ڈالے گا۔ تب میں سمجھوں گا کہ یہ میرے خلوص کا اعجاز ہے۔ اے میرے ساقی! اے دلدارِ دل نواز! میرا خلوص تجھ سے محوِ التجا ہے کہ تشنگی حد سے بڑھتی جا رہی ہے۔ از راہِ کرم جام پر جام پلائے جا اگرچہ تم بے رخی بھی کر چکے ہو۔ سرد مہری کا مظاہرہ بھی کرتے ہو۔ پھر بھی میرا خلوص ماتھے پر بل نہیں ڈالتا۔ تم سے خفا نہیں ہوتا۔ خود اندازہ لگا لیجئے۔ یہ کتنا عالی ظرف ہے۔ میرے خلوص کا یہ خاصا ہے کہ کسی کی شکایت نہیں کرتا بلکہ خود میرے لیے باعثِ امتحان و آزمائش بنا ہوا ہے۔

یہ نظم بھی نفسیاتِ محبت کا ایک عمیق مطالعہ لیے ہوئے ہے جس میں محبوب کے جور و جفا بھی اس کے لطف و کرم سے بڑھ کر کسی سے کوئی گلہ شکوہ نہیں البتہ قہرِ درویش برجانِ درویش والی بات ضرور ہے۔

من حیث المجموع پروفیسر ظہور احمد فاتح کا سخن نفسیات کی اتھاہ گتھیاں سلجھانے والا ہے۔ کسی بھی شعبۂ حیات کے بارے میں قلم اٹھائیں۔ ان کے کلام کا سوادِ اعظم مشتمل ہے۔ عشق جو ان کے سخن کی جان ہے، آرزو مندی جو ان کا سرمایۂ حیات ہے، ان کی نفسیات دانی کا شاہدِ عادل ہے۔ تہہ در تہہ نفسیات کی پرتیں اٹھتی چلی جاتی ہیں۔ نکاتِ خفیہ کھلتے چلے جاتے ہیں۔ ایسا لگتا ہے کہ علومِ اسلامیہ کے پروفیسر نہیں بلکہ معلمِ نفسیات ہیں۔ وہ شاعری نہیں کر رہے بلکہ نفسیاتی الجھنیں سلجھا رہے ہیں۔ ان کے پیشِ نظر اپنے سماج کی سائیکی جسے حد نظر رکھتے ہوئے وہ نسخہ ہائے موزوں تجویز کرتے چلے جاتے ہیں۔ وہ جزئیاتِ حیات کی روکشی بھی چٹکی بجاتے میں کر جاتے ہیں۔ وہ ایسے موضوع پر موقلمِ سخن کو مصور کر دیتے ہیں کہ جن کی طرف عام طور پر کسی کی توجہ مبذول نہیں ہوتی۔ وہ اپنے دور کے مجیدِ امجد ہیں جو بظاہر ادنیٰ سے ادنیٰ موضوعات کو بھی ارفع خیالات کا جامہ پہنا دیتے ہیں۔ امیدِ واثق ہے کہ بطورِ استشہادات پیش کی جانے والی چند منظومات سے بات پورے طور پر واضح ہو چکی ہو گی۔

ابوالبیان ظہور احمد فاتح کے فلسفیانہ تصورات

فلسفہ کیا ہے؟ اندازِ فکر ہے۔ فلسفہ ایک طریق ہے تدبیر ہے۔ فلسفہ نفسِ مضمون کی گہرائی اور گیرائی کا نام ہے جس نقطۂ نظر سے ایک شاعر و ادیب یا ایک ماہرِ تعلیم کسی موضوع کو زیرِ بحث لاتا ہے۔ وہ اس کا فلسفہ کہلاتا ہے۔ یہ کوئی خفیف و مختصر سلسلہ نہیں ہے بلکہ پیچ در پیچ پھیلتا بڑھتا چلا جاتا ہے۔ شذرہ ھذا میں ہم ابوالبیان ظہور احمد فاتح کے ان فلسفیانہ افکار کا جائزہ لیں گے جو ان کے شعری امکانات میں پائے جاتے ہیں۔ یہاں یہ عرض کر دینا ضروری خیال کرتے ہیں کہ حضرتِ فاتح کا شعری کینوس بے حد وسیع و عریض ہے جس کے آفاق تا حدِ نظر پھیلے ہوئے ہیں۔ وہ بنیادی طور پر ایک راسخ العقیدہ مسلمان ہیں۔ لہٰذا اسلامی طرزِ فکر ان کا بنیادی فلسفہ ہے جو دوسرا بڑا موضوع ان کے ہاں استخدام پذیر ہے۔ وہ ہے فلسفۂ رومان تیسرا موضوع فلسفۂ قومیت ہے۔ ظاہر ہے کہ مسلم قومیت اور پاکستانی قومیت ان کے ہاں شعوری طور پر گہرے نقوش رکھتی ہے۔ چوتھا ان کے ہاں فلسفۂ غم والم ہے جس کے ڈانڈے دور تک پھیلتے چلے جاتے ہیں اور پانچواں فلسفہ کامرانی وتہور ہے جس کی جستجو ہر عالی الذہن انسان کرتا ہے۔ ذیل میں ہم پروفیسر ظہور احمد فاتح کے شعری سرمایہ خصوصاً منظومات میں سے مختلف فلسفیانہ پہلو اجاگر کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔

ابوالبیان ظہور احمد فاتح کے اولین شعری مجموعے ''آئینۂ دل'' مطبوعہ 1980ء میں سے ایک نظم ''سرچشمۂ نور'' خود میں ایک عجیب فلسفہ لیے ہوئے ہے۔ وہ ہے اسلامی طرزِ فکر نظمِ ھذا میں وہ روشنی کے مختلف ذرائع کو بیان کرتے ہوئے یہ باور کرانا چاہتے ہیں۔ یہ سب انوارِ نورِ الٰہی سے مشتق ہیں۔ اور یہ

اسلام کا ایک بنیادی فلسفہ ہے بلکہ فلسفۂ وحدت الشہود سے مماثل ہے۔ ذیل میں نظم کے اشعار پیشِ خدمت ہیں:

یہ تیرے نورِ مقدس کا اثر ہوتا ہے
جس کو مل جاتا ہے وہ شخص امر ہوتا ہے
یہ ترا نورِ جہاں تاب ہے جس کے باعث
عقل فہمیدہ و دل اہلِ خبر ہوا ہے
یہ ترا نور ہے جس نور کے باعث انساں
صاحبِ معجزہ و اہلِ نظر ہوتا ہے
یہ ترا نور تو ہے جس کی پذیرائی سے
ذرۂ خاک دلِ شمس و قمر ہوتا ہے
یہ ترا نور ہے جس کی ضیا پاشی سے
قطرۂ آب گراں قدر گہر ہوتا ہے
یہ ترا نور ہے جو قاطع تاریکی ہے
جس طرح آخرِ شب وقتِ سحر ہوتا ہے
یہ ترا نور ہے آتا ہے توکل بن کر
دل میں جس وقت غم و خوف و خطر ہوتا ہے
یہ ترا نور ہے اس کو بھی بناتا ہے ولی
جس کا ہر لمحہ گناہوں میں بسر ہوتا ہے

نورِ الٰہی میں یہ خاصیت ہے کہ جسے عطا ہو جائے، اسے زندۂ جاوید کر دے۔ یہ وہ نورِ مقدس ہے جو قلوب کو فہم اور عقول کو خبر عطا کرتا ہے۔ نورِ حقیقی حضرتِ انساں کو کرشمہ ساز اور اہلِ بصیرت بنا ڈالتا ہے۔ وہ نورِ چشم ہو یا نورِ ایمان سراسر نورِ یزداں سے تعلق رکھتا ہے۔ نورِ الٰہی میں یہ خاصیت ہوتی ہے کہ مٹی کے ایک ذرے کو غیرتِ آفتاب و رشکِ مہتاب کر دیتا ہے۔ نورِ فطرت اگر ایک بوند میں سرایت کر جائے تو اسے درِ شمیم بنا ڈالتا ہے۔ نورِ حق ظلمت ربا ہے۔ جیسے پو پھٹے تو وجودِ سحر سے ظلمتیں سیماب پا ہو جاتی ہیں۔ اسی طرح نورِ حقیقت کے ہوتے ہوئے اوہام باطلہ جگہ نہیں پا سکتے۔ یہ جہاں محلِ امکانات ہے۔ یہاں بعض اوقات خوف و خطرات انسان کو بری طرح گھیر لیتے ہیں۔ ایسے میں وہ روشنی جسے نورِ رجا کہیے یا

ضیائے توکل قرار دیجئے، آگے بڑھتی ہے اور دلِ انساں کو یاس وحزن سے بچا لیتی ہے۔ ایک وقت ہوتا ہے جب یہ انگارہ ءخا کی اتھاہ گمراہیوں میں بھٹک رہا ہوتا ہے، پھر نورِ اسلام اس کی راہنمائی و دست گیری کے لیے سبقت کرتا ہے اور وہی انسان جو کچھ دیر پہلے طاغوت کا آلہء کار تھا، رو بہ ہدایت ہو کر ایک درویش منش انسان بن جاتا ہے اور اسے ولی اللہ قرار دیا جاتا ہے۔

آپ نے دیکھا کہ ایک نسبتاً مختصر نظم خود میں کیا کیا پہلو رکھتی ہے، اگر ہم اسے فکری نوادرات کا مخزن قرار دیں تو بے جا نہ ہوگا۔

ابوالبیان ظہور احمد فاتح خود ایک مردِ مخلص ہیں۔ وہ خلوص و وفا کے قدر دان ہیں اور ہر ایسا رویہ جو اس کے منافی ہو، اسے پوری شدت سے مسترد کرتے ہیں۔ وہ فلسفہء خلوص و محبت کے بھر پور داعی ہیں اور اپنی زندگی انہوں نے اسی مقصد کے لیے وقف کر رکھی ہے۔ ان کے سخن کا سوادِ اعظم بھی اسی فلسفہ کے افہام و فروغ کے لیے وقف ہے۔ ان کی ایک نظم بعنوان ''اے بندہء اغراض'' جو ان کے پہلے مجموعہء کلام ''آئینہء دل'' مطبوعہ 1980ء میں شامل ہے، ان کے اسی اندازِ فکر کی ترجمان ہے۔ دیکھیے کس دل سوزی سے بندہء اغراض کو مخاطب کرتے ہوئے آئینہ دکھایا گیا ہے:

کرتا ہوں میں اک عرض اگر تو نہ ہو ناراض
ناواقفِ الفت ہے تو اے بندہء اغراض
تو کم نہیں بھنورے سے کہ ہے رس کا ہی رسیا
جب رس نہ ہو پھولوں میں تو کر لیتا ہے اعراض
ہوتے ہیں محبت میں تو برباد بھی ہنس کر
تو تھوڑے سے نقصان سے نہ کر پائے گا اغماض
ایثار جو چاہے گا کبھی تجھ سے تعلق
تو کاٹ کے رکھ دے گا اسے صورتِ مقراض
بہتر ہے کہ تو دشتِ وفا میں نہ قدم رکھ
ہاں مان یہی مشورہء شاعرِ نباض

(صفحہ:61)

مختصر مگر جامع نظم ہے جو غیر مردف ہونے کے ساتھ ساتھ نادر قوافی پر مشتمل ہے جسے ہم جنابِ فاتح کی فنی چابک دستی پر محمول کر سکتے ہیں۔ نظم ھٰذا میں خود غرض انسان کو حقیقت سے باخبر کرنے کی کوشش کی

گئی ہے اور فلسفہء محبت سے پردہ اٹھایا گیا ہے۔ محبت کے تقاضے کیا ہوتے ہیں اور مطلب پرست لوگوں کورویہ کیا ہوتا ہے، درحقیقت اسے ہم عصری بے حسی کے خلاف بھی اعلانِ جہاد قرار دے سکتے ہیں۔ یہ وہ صدائے خاراشگاف ہے جس کی فی الاصل اہلِ دنیا کو ضرورت ہے۔ یہ وہ نسخہء جانفزا ہے جو اس مادی دور میں بھی اکسیر کا درجہ رکھتا ہے۔

اب ایک اور نظم مجموعہء مذکور میں دامنِ توجہ کھینچ رہی ہے۔ نظم کا سرنامہ ہے ''ایمان''۔ اس نظم میں فلسفہء سزا و جزا اور دنیا و آخرت کے حوالے سے بات کی گئی ہے جو بندہء مومن کے لیے کلیدی درجہ رکھتا ہے:

دنیا بشر کے واسطے مانندِ کشت ہے
دوزخ ہے اس کا ماحصل یا پھر بہشت ہے
ہو جان و دل سے کلمہء توحید پر یقیں
ایمان کے امکان کی پہلی یہ خشت ہے
مرنے کے بعد آئے گا ایسا بھی ایک روز
مقصود جس کا فیصلہ خواب و زشت ہے

(صفحہ:68)

نظمِ ھٰذا کے شعر اول میں ایک فطری نوعیت کی صنعتِ تلمیح بہ اندازِ تشبیہہ وارد ہوئی ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کا فرمانِ عالیشان ہے کہ دنیا آخرت کی کھیتی ہے۔ درحقیقت بنائے فلسفہ یہ ہے کہ انسان یہاں جو اعمال کرتا ہے، ان کا مآل آخرت میں منتج ہوتا ہے۔ لہٰذا انسان کو اپنے افعال کی ذمہ داری لینا ہوگی۔ اس فلسفہ کو عرفِ عام میں مکافاتِ عمل کا نام بھی دیا جا سکتا ہے کیونکہ اگر وہ اچھے اعمال کرے گا تو دنیا میں ایک نیک نام ٹھہرے گا اور اگر برے اعمال کرے گا تو اسے دنیا میں بھی رسوائی کا سامنا کرنا ہوگا اور آخرت میں بھی عذابِ جہنم سے دوچار ہونا پڑے گا۔

ابوالبیان ظہور احمد فاتح خوشی کے بڑے دل دادہ ہیں۔ ان کا فلسفہء حسن بے حد نشاط انگیز ہے اور وہ جزئیاتِ جمال مزے لے لے کر بیان کرتے ہیں۔ جس سے ایک سرشاری اور سرمستی کی کیفیت کلام میں پیدا ہو جاتی ہے اور دلِ قارئین جھوم جھوم اٹھتا ہے۔ زیرِ نظر نظم اسی قبیل سے تعلق رکھنے والی شہکار منظومات میں شامل ہے جو زلفِ عنبریں سے معنون ہے اور مجموعہء کلام ''سنہرے خواب مت دیکھو'' مطبوعہ دسمبر 2004ء سے لی گئی ہے۔ اس میں زلفِ جاناں کے مختلف کیفیات سے محظوظ و مستفیض ہونے کے حوالے

پائے جاتے ہیں۔ نظم کچھ یوں ہے:

مرے جنوں کو تمنا ہے کالے بادل کی
یہ شرط ہے کہ وہ بادل ہو کالی زلفوں کا
مرے خلوص کو مطلوب ہے گھنی چھاؤں
دعا ہے یہ کہ وہ چھاؤں ہو تیری زلفوں کی
مرے خیال کو خواہش ہے ایسی خوشبو کی
تری کھلی ہوئی زلفوں سے جس کو نسبت ہو
اک ایسی رات کی حسرت ہے میرے خوابوں کو
سیاہی زلفوں کی شامل ہو جس کی ظلمت میں
تلاش کرتا ہے رم جھم وہ میرا ذوقِ جمال
ہو زلفِ تر سے ہی منسوب جس کا ہر قطرہ

(صفحہ:43)

ذوقِ لطیف کے مطالبات اور اس کی تسکین کا سامان زلفِ محبوب کی مختلف کیفیات ہر کیفیت میں ایک سامانِ دلبستگی ،فلسفۂ عیش ونشاط اور فلسفۂ، حسن و جمال کا دلنشیں سنگم ہے جس پر جنابِ فاتح جیسے سخن ور کی دستگاہ ممکن ہے۔ ذرا غور فرمائیے کہ کیسے کیسے عمیق حسیاتی امکانات درِ دل پر دستک دیتے محسوس ہوتے ہیں۔ لازم وملزوم کی کیسی جوڑیاں ہیں جن کا تال میل فلسفۂ قرار وسرور کو تقویت دے رہا ہے۔ جنون سے بادل کا جوڑ اور اس بادل کی نسبت کالی زلفوں اور وہ زلفیں محبوبِ دل نواز کی شبِ وصال کی حسرت جس کی سیاہی زلفِ جاناں سے مستعار لی گئی ہو، ذوقِ جمال کو رم جھم کی آرزو اور وہ رم جھم گیسوئے یار کی تر بہ تر حالت کہ جس سے مہکتی بوندیں گر رہی ہوں۔

آیئے اب ایک اور فلسفیانہ موشگافی کی طرف بڑھتے ہیں اور وہ ہے فلسفۂ موت۔ میر نے کہا تھا:

موت اک ماندگی کا وقفہ ہے
یعنی آگے بڑھیں گے دم لے کر

اسی طرح اقبالؔ نے کہا تھا:

مرنے والے مر تو جاتے ہیں فنا ہوتے نہیں
در حقیقت وہ کبھی ہم سے جدا ہوتے نہیں

اسی طرح راقم کا بھی ایک شعر ہے:

لوگ زندوں سے پیار کرتے ہیں
ہم تو دونوں سے پیار کرتے ہیں

بالکل اسی طرح پروفیسر ظہور احمد فاتح کے ہاں بھی موت ایک زندہ حقیقت ہے۔ وہ پسِ مرگ تو نوحہ خوانی اور رونے بسورنے کے قائل نہیں، وہ رفتگاں سے بھی پیار کرتے ہیں۔ ان کا سوگ اظہارِ تعزیت میں مناتے ہیں۔ عالمِ راحت کو نظم کے دل نشیں پیرائے میں رقم کرتے ہیں۔ پسِ وفات بھی استخدامِ وفا کرتے ہیں۔ ان کی نظم ''معذرت'' اس سلسلے کا ایک روشن حوالہ ہے۔ نظم کے چند بند ہدیۂ قارئین ہیں:

جواب کیسے تجھے دوں ترے سوالوں کا؟
میں دل کو کیسے پرو کر دکھاؤں تیروں میں
یہی سمجھ لے کہ تدبیر کارگر نہ ہوئی
یہ جان لے کہ ہوں تقدیر کے اسیروں میں
یہ کون چاہتا ہے اس کا پیار لٹ جائے
کسے گوارا ہے محبوب کا جدا ہونا
ہوں اس عذاب کے باوصف بھی اگر زندہ
کہاں عیاں ہے مرا اس سے بے وفا ہونا
خوشی سے روح بدن سے جدا نہیں ہوتی
ضرور دستِ اجل درمیان ہوتا ہے
نہیں ہے اہلِ زمانہ کو اس کا اندازہ
فراق ایک بڑا امتحان ہوتا ہے

(''سنہرے خواب مت دیکھو''۔ صفحہ 74-75)

نظمِ ھذا جنابِ فاتح کے فلسفہ موت کے افاق و اعماق کا احاطہ کرتی ہے۔ موت ایک بے بسی کا نام ہے جسے تسلیم و رضا کے پہلو سے قبول کرنا چاہیے۔ اسے کاتبِ تقدیر کا فیصلہ اور لکھا سمجھنا چاہیے۔ مرنے والوں کے ساتھ ان سے محبت کرنے والے پسماندگان مر نہیں جاتے البتہ ان کا جشنِ غم ضرور مناتے ہیں جو آہ و فغاں اور گریہ و ماتم کی صورت میں نہیں بلکہ صبر و شکیب کے انداز میں نہایت متانت سے ہونا چاہیے۔ محبت نالہ و شیون اور ہائے وائے کا نام نہیں ہے۔ نہ جانے والوں سے عقیدت کے اظہار کا یہ

مناسب طریقہ ہے بلکہ ابوالبیان ظہور احمد فاتح کا فلسفۂ تقریبِ مرگ یہ ہے کہ انسان ضبط کے تقاضے نبھاتے ہوئے جدائی کے سوگ کا اظہار اپنے دکھ بھرے اشعار میں ایسے بلیغ انداز میں کرے کہ سوگواری کو برقرار رکھتے ہوئے وفاداری کے جذبات بھی مجروح نہ ہوں۔

حقوقِ عالم میں عالمی پیمانے پر جو مسلم حقوق ہیں ان میں سے ایک آزادی بھی ہے۔فلسفہ آزادی یہ ہے کہ ہر انسان کو اور ہر قوم کو آزاد رہنے کا حق حاصل ہے۔خلیفۂ ثانی حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ جن لوگوں کو ان کی ماؤں نے آزاد جنا، تم انہیں غلام بنانے والے کون ہوتے ہو۔ابوالبیان ظہور احمد فاتح بھی اسی فلسفۂ آزادی کے حامی و داعی ہیں۔ ان کا کلام آزادی کے حق میں صدائے واشگاف ہے۔آزادی چاہے انفرادی ہو یا اجتماعی، وہ اس کے لیے دامے درمے سخنے مصروفِ عمل ہیں۔ تاہم وہ ایسی آزادی کے قائل نہیں جس میں آدمی خود کو مادر پدر آزاد سمجھتا ہے۔ نہ اس آزادی کے حق میں جو اقدار و قوانین کی پروا بھی نہیں کرتی بلکہ جیسے اقبال نے کہا تھا:

صنوبر باغ میں آزاد بھی ہے پابہ گِل بھی ہے
انہی پابندیوں میں حاصل آزادی کو تو کر لے

یا بقول اقبالؔ:

کیا چیز ہے آرائش و قیمت میں زیادہ
آزادیٔ نسواں کے زمرد کا گلوبند

جنابِ فاتح بھی فطری آزادیوں کی وکالت کرتے ہیں۔ ان کی نظم ''آزادی'' جو ان کے دسویں شعری مجموعے ''تصویرِ کائنات'' مطبوعہ 2013ء میں شامل ہے، ہمارے سامنے ہے۔ چند اشعار فلسفۂ خوشی کے تناظر میں ملاحظہ فرمائیں:

ازل سے ابنِ آدم کا حقِ اول ہے آزادی؟
خدائے پاک کی اک نعمتِ افضل ہے آزادی
یہ آزادی ہی قوموں کی ترقی کی ضمانت ہے
یہ آزادی خدائے پاک کا پیغامِ رحمت ہے
یہ آزادی ازل سے حضرتِ انساں کی فطرت ہے
غلامی انفرادی ہو کہ ملی ایک لعنت ہے
غلاموں کی کبھی شیرازہ بندی ہو نہیں سکتی

نصیبِ قومِ محکوماں بلندی ہو نہیں سکتی
یہ آزادی حقیقی زندگی کا نام ہے سن لو
غلام مرگِ ذلت ناک کا پیغام ہے سن لو
یہ آزادی ہی امرتا کا چھلکتا جام ہے سن لو
غلام اک بلائے جان وخوں آشام ہے سن لو
وہ قومیں جو نہیں کرتیں دفاع و قدرِ آزادی
وہ کر دیتی ہیں اپنے ہاتھ سے اپنی ہی بربادی
خوشی بھی اور خوش حالی بھی آزادی کا حاصل ہے
برائے عظمت و جرات غلامی زہرِ قاتل ہے
غلاموں کا نہ کوئی راستہ ہے اور نہ منزل ہے
یہ امر واقعی سارے زمانے میں مسلم ہے
کہ آزادی کا سرمایہ دل و جاں سے مقدم ہے

(صفحہ:-63-64)

درحقیقت یہ نظم فکری وفنی دونوں حوالوں سے ایک بھرپور شعری کاوش ہے۔جس میں مثنوی کا رنگ اپناتے ہوئے پیرائیہء بیان کو وسعت دی گئی ہے کیونکہ مثنوی کی یہ خوبی ہے کہ جملہ مضامین کے لیے حسبِ حال ٹھہرتی ہے۔اس کی ایک خوبی یہ بھی ہے کہ یہ ہر دور میں نظم کی تمام ہیئتوں میں تروتازہ رہی ہے۔اس نظم میں نظامِ قدرت کے حوالے سے مثال دے کر بات واضح کی گئی ہے کہ ازل سے انسان کا اولین حق آزادی ہے جو مالکِ حقیقی کی عظیم نعمتوں میں سے ایک ہے۔اسی میں ہی ارتقائے قوم کی آزادی کا راز مضمر ہے۔دراصل یہ رحمتِ ایزدی ہے جس طرح آزادی ایک نعمتِ غیر مترقبہ ہے۔اسی طرح غلامی ومحکومی لعنت سے کم نہیں ہے کیونکہ کبھی غلام قومیں تنظیم واتحاد سے نہیں رہ سکتیں۔زندگی کی حقیقی معنی خیزی آزادی میں ہی پنہاں ہے۔کیونکہ غلامی قعرِ مذلت سے کم نہیں۔اگر واقعیت نگاری سے کام لیا جائے تو آزادی کسی آبِ حیات سے کم نہیں جبکہ غلامی ایک خون پینے والی بلائے بے درماں ہے۔حصولِ آزادی کے ساتھ ساتھ قدرِ آزادی ودفاعِ آزادی بھی ناگزیر ہے اور وہ اقوام جو اس کی پرواہ نہیں کرتیں،خود ہی اپنی تباہی کی ذمہ دار ہوتی ہیں۔تاریخِ عالم اس امر کی شاہدِ عادل ہے کہ آزادی کی پاسباں ملتیں ہی دنیا میں کامیاب وکامران ٹھہری ہیں۔وہ خوشی ہو یا خوش حالی،آزادی کا ہی ثمرہ ہے۔اس طرح آزادی کے

بغیر دولتِ سکون واطمینان بھی غیر ممکن ہے کیونکہ نہ راہِ راست غلاموں کو میسر ہوتا ہے اور نہ منزلِ مقصود ان کی قسمت میں ہوتی ہے۔ لہٰذا ہمیں چاہیے کہ مسلمہ اصولوں کی روشنی میں متاعِ آزادی کو حرزِ دل و جاں جانیں اور اسے مقدم سمجھیں۔

آپ نے دیکھا کہ فلسفۂ آزادی کو کس مثالی انداز میں پوری شرح و بسیط کے ساتھ مکمل جزئیات کی احاطہ بندی کرتے ہوئے حضرتِ فاتح نے بیان کیا ہے۔ شاذ ہی کسی کے کلام میں حکمتِ حریت کی ایسی تشریح وتوضیح پائی جاتی ہو۔ لہٰذا ہم اس نظم کو ایک بصیرت افروز کاوش اور ایک پرمغز فن پارہ قرار دے سکتے ہیں۔ جس کی آموزش افراد وقوم کے لیے یکساں طور پر مفید متداول ہے۔ نظمِ ھٰذا میں جہاں شاندار تصورات وادراکات پائے جاتے ہیں، وہاں فطری، قدرتی اور تاریخی حقائق کو از راہِ استشہاد پیش کیا گیا ہے جس سے بیان اور بھی وقیع اور مدلل ہوگیا ہے۔

ہر عمل اور ہر انداز کی حکمتیں ہوتی ہیں جن کا اپنا اپنا فلسفہ ہوتا ہے۔ جنون جو مظہرِ دیوانگی یا آسیب زدگی ہے۔ یہ بھی خالی از فلسفہ نہیں۔ اس کے بھی کچھ اسرار و مضمرات ہیں جن پر عمل پیرا ہو کر وظائفِ جنوں بہ حسن وخوبی انجام پاتے ہیں۔ جیسا کہ ابوالبیان ظہور احمد فاتح کی نظم ''جوشِ جنوں'' سے مترشح ہے۔ یہ نظم ان کے مجموعۂ کلام ''تصویرِ کائنات'' سے لی گئی ہے۔ نظم کی اٹھان کچھ یوں ہے:

جی میں آتا ہے کہ اپنا حال رندانہ کروں
پھر چلوں اور بیعتِ محبوبِ مے خانہ کروں
رات دن گھوما کروں دشت و بن کہسار میں
ذرہ بھر بھی دنیائے ناداں کی پروا نہ کروں
سبزہ زاروں کو جلا ڈالوں دروں کی آگ سے
اپنے پاگل پن سے ہر دانا کو دیوانہ کروں
عالمِ دیوانگی میں سب کو متوجہ کروں
اپنی نادانی سے ہر اپنے کو بیگانہ کروں
سنگ زن ہوں لوگ مجھ پر ہو جہاں سے بھی گزر
میں غضب میں آ کے ہر بستی کو ویرانہ کروں
ایسی نیرنگی سی میں پیدا کروں ہر فعل میں
داستانِ زندگی کو اپنی افسانہ کروں

حسرت و رنج و الم دم توڑ دیں جی چھوڑ دیں
اس طرح میں عمر کا لبریز پیمانہ کروں

(صفحہ:80-81)

نظمِ ھٰذا روایاتِ جنوں کی پاسدار ہے جن میں احکامِ دل کی تعمیل کی جاتی ہے۔ یہاں دل یہ مشورہ دے رہا ہے کہ اپنی حالت، وضع قطع مئے خواروں جیسی کر لی جائے اور پھر جانِ مئے کدہ کی بیعت کر کے زندگی اس کی ارادت میں گزار دی جائے۔ شبانہ روز کوہ وصحرا کی خاک چھانی جائے اور اہلِ جہاں کے الزامات کو ہرگز خاطر میں نہ لایا جائے۔ جو شاخسارِ پیش رفت سے مانع ہوں، انہیں جلا کر راکھ کر دیا جائے۔ دیوانگی اس قدر پر جوش ہو کہ بزعمِ خویش فرزانے ہوئے پھرتے ہیں، ان کے بھی دماغ چکرا جائیں اور وہ بھی دیوانوں جیسے اعمال وافعال کرنے لگیں۔ یہ عالم ہو کہ ساری دنیا ہماری طرف متوجہ ہو لیکن اپنی طرف سے ان کے لیے مکمل بے رغبتی ہو۔ جنوں میں ایسا وسوخ حاصل کرلوں کہ مجنوں ثانی بن جاؤں۔ لہٰذا جدھر سے بھی گزروں، لڑکے بالے پتھر مارنے لگیں اور پھر طیش میں آؤں تو بستیوں کو ویرانوں میں تبدیل کرتا چلا جاؤں۔ صرف یہی نہیں بلکہ میرا ہر کام ایک نیرنگی کا حامل ہو۔ یہاں تک کہ پوری زندگی اساطیری رنگ میں رنگ جائے۔ زندگی تو بسر کرنا ہے مگر ایسی با کرامت اور کرشمہ ساز ہو جو سنے حیرت زدہ رہ جائے جو دیکھے مبہوت رہ جائے۔ جیسے یہ زندگی ایک حقیقت نہ ہو بلکہ افسانوی شہکار ہو اور یونہی صدائے رحیل سنائی دینے لگے۔

خود جاذبی، سرمستی وسرشاری کی کیفیت فلسفۂ جنوں کا ایسا روپ ہے جو انسان کو امر کر دیتا ہے اور اس کے کردار کو جاوداں بنا ڈالتا ہے۔ درحقیقت اس شعری کاوش میں سخن ورنے جنوں کے حوالے سے ایک فضا قائم کر دی ہے۔ جو جنوں کا ایک معتبر حوالہ ٹھہرتی ہے۔ یہاں یہ امر بھی قابلِ ذکر ہے کہ جذبات و احساسات کی ایسی شدت موجزن ہے جو شاذ ہی کہیں دیکھی جا سکتی ہے۔ زورِ بیاں اپنی مثال آپ ہے جو فلسفۂ جنوں کی گہرائی وگیرائی کا پوری طرح سامان رکھتا ہے۔

رومان شاعری کا ایک معتبر اور لطیف حوالہ ہے اور ابوالبیان ظہور احمد فاتح کا کم وبیش اسی فیصد کلام رومان کی احاطہ بندی کرتا ہے۔ وہ ہر بات سلیقے سے کرنے کے قائل ہیں یہاں تک کہ رومانی گفتگو بھی فلسفیانہ انداز میں کرتے ہیں۔ جسے ہم حکمتِ کلام سے عبارت کر سکتے ہیں۔ اس وقت ان کی ایک نظم ''باتیں پیار کی'' ہمارے سامنے جوان کے شعری مجموعہ ''تصویرِ کائنات'' سے لی گئی ہے۔ اس نظم میں بھی انہوں نے محبت آمیز گفتگو کو فلسفیانہ انداز میں پیش کیا ہے:

یا تو اے جانِ وفا اتنے نہ یاد آیا کرو
یا بوقتِ یاد میرے پاس آ جایا کرو
بن کے بیگانہ گزر جاتے ہو کیوں تم دور سے؟
میری اس ویران کٹیا میں بھی ستایا کرو
نارِ فرقت میں نہ تڑپایا کرو اے جانِ من
تیر نظروں کے چلا کر مجھ کو تڑپایا کرو
حرفِ الفت مژدہء لطف و کرم احوالِ دل
کچھ تو اے زہر جبیں ارشاد فرمایا کرو
تم ہی میرے چاند ہو مجھ پر فراواں چاندنی
تم ہو میرے پھول مت آزار پہنچایا کرو
زیب کب دیتی ہے ان شیریں لبوں پر تلخ بات؟
اے مرے غنچہ دہن تم پھول برسایا کرو
زلفِ پیچیدہ کو سلجھاتے ہو جس خوبی کے ساتھ
میرے پیچیدہ مسائل کو بھی سلجھایا کرو

(صفحہ:90-91)

ذرا طرزِ کلام ملاحظہ ہو۔کس دانشِ بیان کو بروئے کار لاتے ہوئے محبوبِ جاں نواز سے محبت آزمائی ہو رہی ہے۔اے میرے دوست! یا تو اتنے نہ یاد آیا کرو یا پھر میری بے تابیوں کا احساس کرتے ہوئے بوقتِ یاد فوراً وارد ہو جایا کرو تاکہ تسکینِ دل کا سامان ہو۔بھلا یہ بھی کوئی دوستی ہے کہ اجنبیوں کی طرح دور سے گزر جاتے ہو۔کیا اچھا ہو کہ کچھ دیر میرے اس ویران جھونپڑے میں ستا لیا کرو۔جانِ من یہ کونسا اندازِ محبت ہے کہ مجھے آتشِ ہجر میں جلاتے رہتے ہو۔اگر تڑپانا ہی ہے تو سامنے بٹھا کر اپنی نگاہوں کے تیروں کا ہدف میری جانِ زار کو بنایا کرو۔ہم تو چاہتے ہیں کہ آپ کے شیریں لبوں سے محبت بھرے الفاظ ادا ہوں۔آپ ہمیں اپنے لطف و کرم کی بشارتیں سنایا کریں اور ساتھ ہی ساتھ کیفیاتِ قلب سے بھی آگاہ کیا کریں۔ضروری ہے کہ ان شیریں لبوں سے کچھ نہ کچھ گفتگو جاری ہے تاکہ سماعت نوازیاں ہوتی رہیں۔اے میرے رشکِ ماہ! ماہتابِ حسن میرے لیے عام ہو۔اے میرے غیرتِ گل تم خار نہیں ہو کہ تم سے آزار پہنچے بلکہ تم تو میرے لیے راحت و فرحت کا باعث بنا کرو۔خدا نے تمہیں شیریں لبوں سے

نوازا ہے تو انہیں تلخ باتوں سے آلودہ نہ کیا کرو بلکہ غنچہءِ دہنی کا تقاضا یہ ہے کہ تمہاری چاہت کی مہک شاملِ گفتگو رہے۔ خدا نے تمہیں یہ صلاحیت بخشی ہے کہ الجھے ہوئے گیسوؤں کو بڑی خوب صورتی سے سلجھا لیتے ہو تو کیا میرے پیچیدہ مسائل و حالات کا یہ حق نہیں بنتا کہ انہیں بھی تم ناخنِ تدبیر سے حل کرتے رہو؟

آپ نے دیکھا کہ کس منطق کو بروئے کار لاتے ہوئے شاعر نے بڑے فلسفیانہ انداز میں اپنے یارِ ہزار شیوہ سے اپنے مطالبات منوانے کی کوشش کی ہے۔ واضح رہے کہ یہ نظم صنائع بدائع کے حوالے سے بھرپور ہے۔ اس میں مکمل ابلاغ پایا جاتا ہے۔ عرفانِ ذات جزوِ حیات ہے۔ میر تقی میرؔ نے کہا تھا:

مستند ہے میرا فرمایا ہوا
سارے عالم پر ہوں میں چھایا ہوا

ہر چند کہ یہ ایک تعلیٰ ہے لیکن وقت نے یہ ثابت کر دیا کہ یہ بات کہنے والا شخص واقعی ایک بہت بڑے قد و قامت کا مالک تھا جسے بادشاہِ سخن کے خطاب سے نوازا گیا۔ ابوالبیان ظہور احمد فاتح بھی اپنے عہد کے ایک عظیم شاعر ہیں۔ انہیں اپنی ریاضت کا اندازہ ہے۔ چنانچہ ان کی ایک نظم ''میرا کلام'' کے عنوان سے جو ان کے مجموعہ کلام ''چہرہءِ ہستی'' میں شامل ہے، ہدیہءِ قارئین کی جاتی ہے:

تیرا پرتو اے سراپا ناز ہے میرا کلام
تیرے حسنِ کرم کا اعجاز ہے میرا کلام
اس کا ہر شعر حسیں ہے آئینہءِ حق نما
زندگی کا حریمِ راز ہے میرا کلام
جس کے ہر اک تار میں مضمر ہے سحرِ سامری
وہ سریلا اور دل کش ساز ہے میرا کلام
کیوں نہ ہو اے ہم نشیں ہر قلب پر اس کا اثر؟
قلب سے نکلی ہوئی آواز ہے میرا کلام
ہے یہ میری عقل و درک و فہم کا آئینہ دار
میرے مافی القلب کا غماز ہے میرا کلام
گمرہوں کا راہنما ہے ظالموں کا محتسب
غم زدوں کا مونس و دم ساز ہے میرا کلام

ہر جگہ چرچے ہیں اس کی رفعتِ تخیل کے
مثلِ شاہین بلند پرواز ہے میرا کلام
ہر سخن فہم و سخن ور کو ہے اس کا اعتراف
رشکِ شعر شاعرِ شیراز ہے میرا کلام
مجھ کو اب حاجت نہیں فاتح کسی اعزاز کی
میری ہستی کے لیے اعزاز ہے میرا کلام

(صفحہ:17-18)

ایک جید عالم کی طرح جسے اپنے علم پر ناز ہوتا ہے،ظہور احمد فاتح بھی اپنے کلام کی خوبیوں سے آگاہ ہیں۔اس لیے ان کے سخن میں تعلیاتی شواہد وفور سے پائے جاتے ہیں جو اس امر کے شاہدِ عادل ہیں کہ سخن ور کو اپنی فنی استعداد کا پورا پورا استحضار حاصل ہے۔لہٰذا وہ رقم طراز ہیں کہ میرا کلام ایسا ہے کہ جس پر سخن ورانِ شیراز بھی رشک کرتے ہیں۔واضح رہے کہ شیراز ایسی دھرتی ہے جہاں شیخ سعدی شیرازی اور خواجہ حافظ شیرازی جیسے جلیل القدر شعرا نے فن کی جوت لگائی ہے۔

چنانچہ وہ محبوب سے مخاطب ہو کر کہتے ہیں کہ جس طرح تیرا حسن زمانے میں مسلم ہے،اسی طرح میرا کلام بھی ایک معتبر عصری حوالہ ہے کیونکہ یہ تیرے جمال کا پرتو ہے۔اس میں جو مقناطیسیت پائی جاتی ہے۔وہ تیرے حسنِ گرم کا کرشمہ ہے۔اس کے ہر شعر میں یہ خاصیت ہے کہ حق نما آئینے کی طرح موثر ہے۔اس میں اسرارِ زیست جا بجا پائے جاتے ہیں۔یہ وہ ساز ہے جس کے ہر تار میں سحرِ سامری کی کیفیات ہیں۔یہ تو ایک سریلے اور دل کش ساز کی طرح ہے۔اس کا اثر براہِ راست دلوں پر ہوتا ہے۔کیونکہ یہ دل سے نکلی ہوئی پر درد صدا ہے۔شعر شاعر کے قلب و ذہن کا آئینہ دار ہوتا ہے۔لہٰذا اس میں بھی میری ذہانت و فراست جھانکتی ہے۔میں اپنے سخن میں اپنا ما فی الضمیر پیش کرتا ہوں۔میرے کلام میں یہ خوبی ہے کہ یہ بھولے بھٹکے لوگوں کو راہ دکھاتا ہے اور ظالموں جابروں کی گرفت کرتا ہے جیسے کوئی محتسب مجرموں کی تادیب کرتا ہے۔اہلِ غم کا غم خوار ہے۔یہ کوئی ایسا ویسا کلام نہیں بلکہ رفعتِ تخیل اور حسنِ تصور سے مزین ہے۔نیز اہلِ عالم اس کے قائل و مائل ہیں۔اس کی بلندیوں کا یہ عالم ہے کہ پروازِ افکار مثلِ عقاب اوجِ فلک پر ہے۔مجھے کسے تمغے یا کسی ایوارڈ کی مطلق پروا نہیں ہے کیونکہ میرے لیے میرا کلام ہی باعثِ اعزاز و افتخار ہے۔

یہ نظم جہاں تعلیاتی پہلو خود میں سموئے ہوئے ہے، وہاں یہ فلسفیانہ شعور سے بھی مرصع ہے۔ہر شعر

میں حوالہ کوئی نہ کوئی ضرور پایا جاتا ہے جو رفعتِ کلام اور جودتِ فکر کے لیے ناگزیر ہوتا ہے۔ وہ فنی چابک دستی ہو یا فکری بالیدگی، وہ تشبیہات ہوں یا استعارات، ہر فنی تلازمہ نظمِ ھٰذا میں جلوہ گر ہے۔

چلتے چلتے ایک اور مرصع نظم بعنوان ''زندگی'' جو مجموعۂ کلام ''چہرۂ ہستی'' میں شامل ہے، اپنی طرف متوجہ کرتی ہے۔ یہ نظم فلسفۂ حیات کی آئینہ دار ہے۔ ویسے تو تو حکمتِ زندگی کو ہر شعبہ ہستی سے تعلق رکھنے والے دانش وروں نے کھولا ہے لیکن اس کی شعری نقاب کشائی اور ادبی صراحت جس انداز میں ابوالبیان ظہور احمد فاتح نے فرمائی ہے، وہ دیدنی وشنیدنی ہے۔ یہاں بھی بلاتمہید ہم ان کی نظم کے اشعار بدون تبصرہ رقم کیے دیتے ہیں۔ نظم کا ہر شعر مکمل ابلاغ رکھتا ہے اور قاری خود اس کی نسبت سے بہتر فیصلہ کرسکتا ہے کہ یہ نظم کس پائے کی ہے۔ نظم سے پہلے ان کی غزل کا ایک شعر صورتِ حال کی نسبت سے درج کرنا مناسب خیال کرتا ہوں:

گتھیاں زیست کی سلجھانے کا فن جانتے ہیں
زندہ رہتے ہوئے مر جانے کا فن جانتے ہیں

اب ان کی نظم ملاحظہ ہو:

دفترِ ہستی میں اک بے حد حسیں تصویر ہے
جس کی پیشانی پہ لفظِ زندگی تحریر ہے
زندگی اک راز ہے ایسا کہ کھل سکتا نہیں
زندگی خود اپنی اک آسان سی تفسیر ہے
زیست کے بارے میں اکثر سوچتا رہتا ہوں میں
زندگی کس واسطے انساں کی دامن گیر ہے؟
زندگی اک دو رخی تصویر کی آئینہ دار
زندگی تحسین ہے اور زندگی تحقیر ہے
زندگی پیغامِ غم ہے ، زندگی شادی کا نام
زندگی انعام ہے اور زندگی تعزیر ہے
زندگی قدرت کی صناعی کی تابندہ مثال
زندگی اک خواب ہے جس کی نہاں تعبیر ہے
زندگی اک امتحاں ہے واسطے انسان کے

زندگی زہرِ ہلاہل درمیانِ شیر ہے
دو مخالف راستوں پر گامزن ہے زندگی
ان میں پہلا ارتقا ہے دوسرا تدمیر ہے
زندگی بارِ گراں ہے زندگی پر کیف ہے
شاد ہے غمگین ہے تخریب ہے تعمیر ہے
زندگی دار المحن ہے زندگی تفریح گاہ
زندگی واحد شرابِ مختلف تاثیر ہے

(صفحہ:71-72)

وہ تلخابہء زیست ہو یا شیرینیء حیات، وہ چمنستانِ محبت ہو یا خارزارِ رزم ہو، دبستانِ دین ہو یا گلستانِ شعروادب، وہ احساسِ نشاط وسرور ہو یا محسوساتِ رنج والم، وہ وارداتِ دل ہو یا سحرِ حسن وجمال، وہ سوزِ ہجر ہو یا کیفیاتِ وصال، وہ ذاتی حوالہ ہو یا قومی، وہ امورِ داخلیت ہو یا معاملاتِ خارجیت، کوئی شعبہ بھی ایسا نہیں جس میں کوئی نہ کوئی فلسفہ کارفرمانہ ہو۔ چنانچہ پروفیسر ظہور احمد فاتح کے ہاں ان تمام شعبوں کی حکمت ودانش پوری ہمہ گیری سے استخدام پذیر ہے۔ جن کے استشہادات ہم نے گزشتہ صفحات میں مع امثلہ پیش کیے ہیں۔ یہاں یہ امر اظہر من الشمس ہوجاتا ہے کہ ان کے ہاں عمیق حسیات اور وسیع تر مطالعہ کے باعث فلسفیانہ تصورات بھرپور طور پر اجاگر اور لکھے ہوئے ہیں۔ ابہام وایہام کی ان کے ہاں کوئی گنجائش نہیں ہے۔ وہ پوری منطقیت اور وضاحت سے سلسلہ کلام چلاتے ہیں جس میں منطقیت اور معروضیت کے اجزا پوری طرح بہار دکھا رہے ہوتے ہیں۔ انہیں قدرت نے بلند شعور سے نوازا ہے۔ لہٰذا ان کی نگارشات بھی علوئے فکر کی عمدہ مثالیں ہیں۔

ابوالبیان ظہور احمد فاتح کے سخن میں رومانی عناصر

رومان ایک ایسا دلکش لفظ ہے جو خود میں جہانِ معنی لیے ہوئے ہے۔ خصوصاً مہر و محبت، عشق و خلوص، لطف وزیبائی، حسن ورعنائی، جنوں و تفریح اور دل کشی و دل آویزی جس کے عناصر ترکیبی ہیں۔ اگر رومان کو اساسیاتِ حیات میں شامل کیا جائے تو بے جا نہ ہوگا۔ یہ سچ ہے کہ عام طور پر اسے عشرتِ زیست کا ذریعہ گردانا جاتا ہے مگر فی الحقیقت یہ تعیّشات تک محدود نہیں بلکہ ضروریات کا درجہ رکھتا ہے۔ اگر ہم ابوالبیان ظہور احمد فاتح کے سخن کا مطالعہ کریں تو یہ کہنے میں ہمیں ذرا بھی باک نہیں ہے کہ وہ شاعرِ رومان ہیں۔ اگرچہ ان کا کلام ایک بحرِ ذخار کی مانند ہے۔ جس میں ہر طرح کے دریا آ کر گرتے ہیں۔ ان دھاروں میں قومی اور ملی شاعری بھی ہے، مذہبی اور دینی افکار بھی ہیں، معاشی اور معاشرتی پہلو بھی ہیں، نفسیاتی اور فلسفیانہ فضا بھی ہے لیکن سب سے زیادہ اور سب سے گہرا کام بسلسلۂ رومان ہے جو ان کا اوڑھنا بچھونا ہے۔ یہ ایک ایسا بسیط سلسلہ ہے جو کہیں ختم ہوتا نظر نہیں آتا اور دیگر تمام سلاسل پر حاوی ہے۔

محب اور محبوب کے جو جوڑے معروف ہیں، ان میں انسانوں کے علاوہ اشیا سے متعلق بھی ایسی جوڑیاں پائی جاتی ہیں جن کا باہمی تعلق دراصل تعلقِ عشق و محبت خیال کیا جاتا ہے اور نہیں شعری تشبیہات و استعارات میں برتا جاتا ہے۔ شمع و پروانہ، ماہ و قمری وغیرہ۔ اس وقت ابوالبیان ظہور احمد فاتح کی ایک نظم ''پروانہ شمع سے'' مشمولہ ''آئینۂ دل'' مطبوعہ 1980ء ہمارے روبرو ہے۔ نظم ھٰذا میں پروانے کے جذبات کی عکاسی کی گئی ہے جو وہ شمع کے گوش گزار کرنا چاہتا ہے۔ نظم ملاحظہ ہو:

نہ آپ ہوں خفا اگر

کہوں فدا ہوں آپ پر
ہیں آپ بارِ دِجگر
مرے حبیبِ قلب وجاں
ہیں آپ جنتِ نظیر
میں آپ کی تلاش میں
پھرا کیا ہوں در بدر
کسی دن تو مری فغاں
کرے گی آپ پر اثر
نہ کیجئے گا بے رخی
ہے آج دل فسردہ تر
میں ہو چکا ہوں آپ کا
مجھے نہ جانیے دگر

(صفحہ:65)

غزل نما نظم غیر مردف چھوٹی بحر سلیس ورواں بحر ہزج مربع مقبوض انداز تخاطب آمیز، محبت انگیز، پروانہ شمع سے یوں گویا ہے کہ حضور! اگر آپ ناراض نہ ہوں تو گزارش کروں کہ میں آپ کا جان نثار ہوں۔ کیونکہ آپ مقصودِ خاطر بھی ہیں اور جگر کی ٹھنڈک بھی۔ شعلہ زن شمع کو جگر کی ٹھنڈک کہنا گویا معراجِ عشق ہے۔ آپ میرے محبوبِ دل وجاں بھی ہیں اور فردوس ونظر بھی۔ ایک دن ایسا بھی ضرور آئے گا کہ جب میری فریاد آپ کے دل پر موثر ہو گی۔ حسبِ معمول سرد مہری مت دکھایئے گا کیونکہ آج دل بہت زیادہ غمگین ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ میں آپ کی محبت میں فنا ہو چکا ہوں۔ ایک جذب وغم کی کیفیت طاری ہے۔ لہٰذا مجھے الگ کوئی وجود نہ جانیے گا۔

اس نظم کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ ابو البیان ظہور احمد فاتح کے ہاں ایک بھرپور رومانوی فضا پائی جاتی ہے۔ یہاں تک کہ علاقائی اشیا میں بھی محبت کی فراوانی کا اظہار رہے۔ ایک مقام پر خود کہتے ہیں:

یہی ہے معیار عظمتوں کا یہی چلن ہے شرافتوں کا
جو باوفا ہیں جو باکرم ہیں محبتیں بانٹتے رہیں گے

اسی طرح ان کی اکثر نظموں کا حال ہے۔ آیئے ایک اور نظم بعنوان ''وصال کی رات'' مشمولہ

’’آئینۂ دل‘‘ آپ کی نذر ہے۔ یہ ویسے تو ایک طویل قطعہ بند نظم ہے جس کے کچھ قطعات تو تشبیہاتی مطالعہ میں درج کیے جا چکے ہیں، تاہم پہلا اور آخری قطعہ ہدیہ قارئین ہے:

آج مرے پہلو میں تم ہو، آج وصال کی رنگیں شب ہے
آج کی رات مری نظروں میں ساری راتوں سے بہتر ہے
آج خوشی ہے قلبِ حزیں کو، آج مری آنکھوں میں دم ہے
دیکھ رہا ہوں آج کا منظر، کتنا دل خوش کن منظر ہے

رات کی فرحت بخش خموشی اور وصال کے رنگیں لمحے
دل کہتا ہے یہ کیفیت ایک زمانے تک طاری ہو
کاش تمہارا موہن مکھڑا پل پل میرے پیشِ نظر ہو
کاش مری تقدیر میں ساری عمر تمہاری دلداری ہو

(صفحہ:66-67)

قطعہ اول محبوب کے رومانوی تصور کو بطور استشہاد لاتا ہے اور وہ بھی ذاتی تجربہ ہے کہ وصالِ محبوب نے روز و شب کو رنگین کر دیا ہے۔ شاعر کی آنکھوں میں دم آ گیا ہے اور ہر طرف مناظر خوش نما دکھائی دینے لگے ہیں۔ وصال کے دلکش لمحات میں رات کی خاموشی کو بھی فرحت بخش بنا دیا ہے جو ایک رازدارنہ حوالہ ہے۔ لہٰذا یہ دعا لب پہ آتی ہے کہ ایسی دلآویز کیفیتِ وصال تا حینِ حیات جاری رہے۔ آخری بند میں شاعر یہ دعا مانگ رہا ہے کہ خدا کرے کہ تمہارا خوب صورت چہرہ ساری زندگی میری آنکھوں کے سامنے رہے۔ کاش قدرتِ کاملہ اسی طرح مجھ پر مہربان رہے اور زندگی بھر میری قسمت میں تمہاری دل نوازیوں کا سلسلہ جاری رہے۔

آپ نے دیکھا کہ نظم کا ایک ایک حرف، ایک ایک لفظ اور ایک ایک مصرع جذباتِ محبت سے معمور ہے۔ ایک زبردست سرشاری و سرمستی کی فضا ہے جو اول تا آخر ایک تواتر سے کارفرما ہے۔ جس میں احساسات ہیں۔ رنگ و آہنگ ہے۔ تجربات و مشاہدات ہیں۔ دعائیں اور آرزوئیں شامل ہیں۔

رومان کے مختلف مظاہر ہیں جن میں سے ایک سرمستی و سرشاری اور خود سپردگی بھی ہے جو جنونِ عشق سے علاقہ رکھتی ہے۔ جب محبوبِ دل نواز سے ملاقات کے امکانات روشن ہوتے ہیں تو عاشق از خود رفتہ انھی کیفیات کا اظہار کرتا ہے۔ کچھ ایسے ہی افکار اس کے دامن گیر ہوتے ہیں جیسے ابوالبیان ظہور احمد فاتح

کی نظم ”راحتِ ہوش ربا“ مشمولہ ”آئینۂ دل“ میں پائے جاتے ہیں:

اے دل وہ دیکھ آگئی فصلِ بہار ناچ
گا گا کے ، جھوم جھوم کے بے اختیار ناچ
لے آ گئے ہیں راحتوں کے عشرتوں کے دن
لے کٹ گئی ہے آج شبِ انتظار ناچ
کتنا حسیں یہ موسمِ عیش و نشاط ہے
اے دل ادائے شکر کر تو بار بار ناچ
لے آ گیا ہے آج وہ محبوبِ نازنیں
اے دل وفورِ کیف سے دیوانہ وار ناچ
ہرگز نہ کچھ خیال کر دنیا جہان کا
پی کر شرابِ بے خودی مستانہ وار ناچ
فاتح پہ آج آمدِ جبریلِ شعر ہے
کاغذ پہ کر قلم رقم نقش و نگار ناچ

(صفحہ:69)

جب بے خودی و مستی کا عالم انسان پر طاری ہوتا ہے تو وجد کی سی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے اور رقص کرنے کو جی چاہتا ہے۔ اسی کیفیت کا اظہار نظمِ ھٰذا میں پایا جاتا ہے۔ چنانچہ وہ اپنے دلِ مواج سے مخاطب ہے۔ اے میرے دل دیکھ موسمِ گل آ گیا ہے۔ فضا میں رنگینی و رعنائی ہے۔ لہٰذا حالات اس امر کا تقاضا کرتے ہیں کہ تجھے ناچنا ہوگا اور اپنی مسرت کا اظہار کرنا ہوگا۔ تجھے چاہیے کہ نغمہ خواں ہو جا اور مستانہ وار محوِ رقص ہو جا۔ اب خوشیوں اور آرام و سکون کے ایام آ گئے ہیں۔ انتظار کی طویل اور تیرہ رات کٹ گئی ہے۔ ہاں یہ عیش و نشاط کا زمانہ ہے۔ ادائے شکر ضروری ہے اور اہلِ جنوں اظہارِ تشکر کرتے ہیں۔ لہٰذا اے میرے دل تجھے بھی ناچنا ہوگا۔ وہ یارِ نازنیں جس کا انتظار تھا، آ گیا ہے۔ پس تو بھی والہانہ طور پر رقص کر۔ اس کی پروا کرنے کی مطلق ضرورت نہیں ہے کہ اہلِ زمانہ کیا کہتے ہیں۔ لوگ کیا تبصرہ آرائیاں کرتے ہیں۔ لہٰذا بے خودی کی مے نوش کرتے ہوئے دیوانہ وار ناچنا ہوگا۔ کسی ملامت کی پروا کیے بغیر دیوانہ وار ناچنا ہوگا۔ آج دل و دماغ پر نزولِ اشعار ہے جیسے جبریلِ شعر کی آمد آمد ہو۔ اے میرے قلم تو بھی کسی سے پیچھے نہ رہ۔ اس طرح رقصاں ہو کہ کاغذ پر نقش و نگار مرتسم ہوتے چلے جائیں۔ نظمیں اور غزلیں تشکیل پاتی

چلی جائیں۔

یہ نظم بھرپور طربیہ کا درجہ رکھتی ہے جس میں عیش وطرب ہے۔ راحب وفرحت ہے۔ مستی وسرشاری ہے۔ بے خودی ودیوانگی ہے۔ ایک جشن کا سماں ہے۔ ایک وجد کا عالم ہے۔ اک حال کی سی کیفیت ہے۔ دراصل اردو زبان میں ایسی طربیہ فضا کم ہی مشاہدہ کی گئی ہے۔ لگتا ہے کہ شاعر مارے مسرت کے جامے سے باہر نکلا چاہتا ہے۔ واقعہ یوں ہے کہ اس طرح کی نظمیں مشرقی شعریات میں شاذ ہی نظر آتی ہیں۔

عالمِ رومان میں جب محبوب سامنے ہو تو اہلِ دل صرف لمحہء موجود کی فکر نہیں کرتے۔ ان کی کوشش یہ ہوتی ہے کہ یہ ملاقاتیں باقاعدہ ہو جائیں۔ اسی تاثر کی حامل نظم ''التماس'' مشمولہ ''آئینہء دل'' ہمارے سامنے ہے جس میں محبوب سے استدعا کی جا رہی ہے کہ بے شک آپ نے کرم فرمائی کی ہے کہ آپ تشریف لائے ہیں، بڑی عنایت ہو اگر اسی طرح روزانہ آپ کی تشریف آوری ہوتی رہے اور پیاسی نگاہوں کی پیاس بجھتی رہے۔ پہلے نظم پڑھتے ہیں:

واسطہ ہے دوستی کا روز آیا کیجئے
اے مرے دلدار آ کر دل لبھایا کیجئے
تم مرے ساقی ہو میرا دل ہو میری جان ہو
بادہء الفت کا پیارے جام لایا کیجئے
ایک پاگل، ایک شاعر، ایک دیوانہ ہوں میں
میری باتوں پر ہمیشہ مسکرایا کیجئے
منتظر رہتا ہے دل تیرے وصال و دید کا
پیاس میرے قلبِ تشنہ کی بجھایا کیجئے
پیار کی باتیں تو کچھ تو کچھ سکونِ قلب ہو
سن کے حالِ ما غریباں کچھ سنایا کیجئے
تم مرے دل کی کلی ہو تم مہکتے پھول ہو
اپنی خوشبوئیں مرے دل میں بسایا کیجئے
ایک لمحہ بھی گراں ہے انتظارِ یار میں
بات یہ فاتح کی پیارے مت بھلایا کیجئے

(صفحہ:70)

اس نظم میں جناب فاتح محبوبِ دل کشا سے مخاطب ہیں اور دوستی کا واسطہ دے کر ملتجی ہیں کہ یہ آنے جانے کا سلسلہ روزانہ رہنا چاہیے تاکہ ہمارا دل بہلا رہے۔ اے مرے دوست تم میرے ساتھ ہو۔ میرے ہم نوا ہو۔ تم میرے ساقی ہو، لہٰذا محبت کا جام لانا مت بھولا کیجئے۔ میرا یہ حال ہے کہ میں ایک پاگل ہوں اور ایک شاعر بھی ہوں۔ اس لیے چاہیے کہ میری باتوں پر مسکراتے رہو اور میری کسی بات کو محسوس مت کرو۔ تمہیں معلوم ہونا چاہیے کہ تمہارے ملاپ اور تمہارے درشن کا ہمیں ہمیشہ انتظار رہتا ہے۔ میرے پیاسے دل کی پیاس تم ہی بجھا سکتے ہو۔ اگر محبت کی گفتگو ہوئی تو دل کو سکون ملے گا۔ کچھ ہمارا حال سنا کیجئے اور کچھ اپنا حال سنایا کیجئے۔ سچ تو یہ ہے کہ تم دل کی کلی ہو، تم گلِ نوشگفتہ ہو لہٰذا یہ میرے دل کا استحقاق ہے کہ اپنی خوشبوئیں اس میں بسایا کرو۔ محبوب کے انتظار میں ایک لمحہ بھی بہت بھاری پڑتا ہے، یہی بات اپنے فاتح کی یاد رکھا کیجئے اور آنے میں تاخیر نہ کیا کیجئے۔

نظم کے مطالعہ سے آپ نے اندازہ لگا لیا ہوگا کہ ان کا رومان کتنا سادہ، کتنا معصوم اور کس قدر پرخلوص ہے۔ وہ اپنا سب کچھ اپنے محبوب کو سمجھتے ہیں۔ اس کا دیدار ان کے لیے نعمتِ غیر مترقبہ ہے اور ان کا وصال دنیا و مافیہا سے بڑھ کر ہے۔ یہی ہے علامت خالص رومان کی، مثالی سچی محبت کی۔

قبل ازیں وصالِ جاناں اور کیفیتِ وصال کے حوالے سے بات کی گئی۔ اب وچھوڑے کا رنگ دکھایا جا رہا ہے جس میں رنج ہے، پریشانی ہے، مایوسی ہے۔ یہ نظم بعنوان ''بچھوڑا'' مشمولہ ''آئینۂ دل'' پیش خدمت ہے:

ہر دم تیرے ہجر میں سائیں روؤں کر کر بین
اشکوں سے سب کپڑے بھیگیں خشک نہ ہوویں نین
سارا دن بے تابی سے ہم تیرا رستہ دیکھیں
دل کو جتنا بہلائیں، ہرگز نہ پائے چین
کروٹ پر ہم کروٹ بدلیں نیند نہ آئے پاس
ترے گن گن آنکھیں سوجیں ختم نہ ہووے رین
اک جانب من موہن سوئے چین کی میٹھی نیند
اک جانب ہم تڑپیں لوٹیں یہ داتا کی دین

(صفحہ:79)

یہ نظم ہندی مزاج کے اثرات خود میں سموئے ہوئے ہے۔ بطورِ خاص ہندی گیتوں کا رنگ اس میں

غالب ہے۔ نیز خالص ہندوستانی پریم جھانکتا ہوا محسوس ہو رہا ہے۔ شاعر محبوب سے مخاطب ہے اور یوں عرض پرداز ہے۔ حضور میں تمہارے ہجر میں پل پل گریہ وزاری سے کام لے رہا ہوں۔ نوبت بہ ایں جارسید اشکوں نے کپڑوں کو بھگو دیا ہے اور نیر ہیں کہ خشک ہونے کا نام نہیں لیتے۔ دن بھر ہم بے قراری میں تیری راہ تکتے ہیں اور باؤلے دل کو جتنا سمجھانے کی کوشش کرتے ہیں دل ہے کہ کسی کروٹ سکون نہیں پاتا۔ رات بھر تیرے ہجر گزیدہ اختر شماری کرتے ہیں اور یہاں تک کہ آنکھیں متورم ہو جاتی ہیں۔ ایک طرف وہ یارِ بے پروا خوابِ خرگوش کے مزے لیتا ہے تو دوسری طرف ہماری قسمت تڑپنا اور لوٹنا ہے۔ لیکن ہم کسی سے شکوہ نہیں کرتے کیونکہ یہ سب قسمت کے کھیل ہیں۔ داتا کی دین ہے۔ جسے خوشی دے، جسے مبتلائے غم کر دے۔

یہ مختصر سی نظم جزیات نگاری اور کیفیات نگاری پر شاہدِ عادل ہے۔ اس میں سوز و گداز خالصتاً ہلکورے لیتا ہوا محسوس ہوتا ہے۔ غمِ ہجر کی آئینہ بندی اس گہرے انداز میں کی گئی ہے کہ فراق رسیدہ انسان کے تمام تر کرب سے آگاہی ہو جاتی ہے۔ زورِ بیان کے قرینے پورے طور پر نبھائے گئے ہیں۔ اس میں ہندی بھاشا کی کوملتا اور سندرتا جھانکتی ہوئی محسوس ہوتی ہے۔ کہیں بناوٹ یا تصنع کا شائبہ تک نہیں۔ سب کچھ فطری سا محسوس ہو رہا ہے۔ محبت میں پاکیزگی ہے، گہرائی ہے اور گیرائی ہے، کرب و درد و سوز ہے جو شاعر کے قادر الکلام ہونے کی دلیل ہے۔ اس میں موضوعِ فراق کو اس کے کلاسیکی اور روایتی رچاؤ کے ساتھ پیش کیا گیا ہے جس سے متقدمین کی یاد تازہ ہو جاتی ہے۔ بین السطور کہیں بھی عامیانہ پن کا احساس نہیں ہوتا۔

آگے چلتے ہیں ایک اور جانِ رومان نظم دامنِ دل کھینچتی ہے۔ یہ نظم بھی خود میں چاہت کی شدت اور جذبات کا والہانہ پن لیے ہوئے ہے۔

میں جس سے تجھ کو تکتا تھا وہ روزن یاد ہے مجھ کو
تو جس کی اوٹ لیتی تھی وہ چلمن یاد ہے مجھ کو
تری ظالم جوانی نے تجھے کتنا بدل ڈالا؟
ترا معصوم سا بھولا سا بچپن یاد ہے مجھ کو
ابھی تک یاد ہے تیرا گلے میں ڈالنا بانہیں
ابھی تک چوڑیوں کی وہ چھنا چھن یاد ہے مجھ کو
تجھے بھی یاد ہو گا یا نہ ہو گا میں نہیں کہتا

جہاں ہم کھیلا کرتے تھے وہ آنگن یاد ہے مجھ کو
وہ سنِ لاشعوری میں جہاں سے بے خبر ہو کر
مرا دلھا ترا بن جانا دلھن یاد ہے مجھ کو
ہمارے پیار کی سرگوشیاں محفوظ ہیں جس میں
وہ جنت رنگ و نکہت بیز گلشن یاد ہے مجھ کو
وہ میرا چھیڑ دینا پیار کے دل چسپ افسانے
وہ تیرا گوش بن جانا ہمہ تن یاد ہے مجھ کو
محبت کرنے والوں نے جسے آباد کرنا تھا
ابھی تک وہ خیالی سا نشیمن یاد ہے مجھ کو
تجھے بھی یاد ہونا چاہیے اے بھولنے والے
وفا کرنے کا جو پیمانِ احسن یاد ہے مجھ کو

(''چہرۂ ہستی''،نظم ''تجھے یاد ہو کہ نہ یاد ہو''۔صفحہ 103-104)

حسرت موہانی کی مشہور غزل کی ردیف کو عنوان بناتے ہوئے حضرت فاتح ایامِ گزشتہ کی رومان آمیز یادوں کو اس نظم میں دہرانے کی کوشش کی ہے جس میں بلا کی برجستگی، سادگی اور بے ساختگی کی کیفیت پائی جاتی ہے۔ بچپن میں لڑکپن کے معصومانہ جذبات اور بے لوث چاہت کی جھلکیاں نظمِ ھذا میں بکثرت ملاحظہ کی جاسکتی ہیں۔ ذرا آپ بھی دیکھیے، لکھتے ہیں۔

گھر کی دیوار کا وہ سوراخ جس سے آنکھ لگا کر میں تجھے تاڑا کرتا تھا۔ وہ مجھے ہنوز یاد ہے اور یہ بھی یاد ہے کہ تو موقع کی نزاکت کو سمجھتے ہوئے چھپنے اور اوٹ لینے کی کوشش کرتے تھے۔ وہ چلمن مجھے نہیں بھولا تم جس کے پیچھے چلے جاتے تھے۔ میرے محبوب تمہاری جوانی تمہیں کتنا تبدیل کر گئی ہے۔ حالانکہ تمہارا بچپن مجھے اچھی طرح یاد ہے۔ جس میں سادگی تھی، معصومیت تھی اور شوخی تھی۔ تمہارا افرطِ محبت سے اپنی بانہیں میرے گلے میں حمائل کر دینا بھی نہیں بھولا اور بازوؤں میں پڑی ہوئی کانچ کی چوڑیوں کی چھنا چھن بھی ابھی تک یاد ہے۔ میں یہ تیقن سے کچھ نہیں کہہ سکتا کہ تمہیں بھی وہ یاد ہوگا لیکن جہاں ہم کھیلا کرتے تھے، آج بھی مجھے وہ آنگن اچھی طرح یاد ہے۔ بچپن کا اابالی پن اہلِ جہاں سے بے خبری کا عالم، خودمستی کی کیفیت، دلھا دلھن بننے کا کھیل کھیلنا بھی کچھ یاد ہے۔ وہ باغ جس میں جنت کی رعنائیاں اور نکہتیں تھیں، جس میں ہم گھومتے پھرتے تھے، جو ہماری پیار بھری کہانیاں سنا کرتے تھے، وہ خیالی سا

گھر جسے ہم دونوں پیار کرنے والوں نے آباد کرنا تھا، ابھی تک میں فراموش نہیں کر سکا۔ اب لگتا ہے کہ تم نے سب کچھ بھلا دیا ہے۔ شاید یہ وہ وعدہء وفا بھی تمہیں یاد نہیں جو ہمارے مابین قرار پایا تھا۔

یوں محسوس ہوتا ہے کہ یہ نظم کیفیات و مناظر کی ایک سچی تصویر ہے۔ جذبات کی آئینہ بندی اس میں بڑی مہارت سے کی گئی ہے۔ یہ ایک ایسا رومانوی مرقع ہے جسے ہم زندہ وجاوید شہکار قرار دے سکتے ہیں۔ اگر حسرت موہانی کی غزل اور اس نظم کا تقابل کیا جائے تو ازروئے انصاف یہ شاہ پارہ اس سے کہیں آگے نظر آتا ہے۔

محبت کے مختلف مراحل ہوتے ہیں۔ ابتدائی ملاقاتیں، وصال کی راحتیں، شکر رنجیاں، جدائی کے خطرات اور الوداعی لمحات۔ مناسب محسوس ہوتا ہے کہ پائینِ شذرہ ہم ایسی ہی ایک نظم آپ کی نذر کریں جس میں اہلِ دل نے الوداعی کلمات ادا کیے ہیں:

اے مری الفت کے مظہر الوداع
الوداع اے شوخ پیکر الوداع
اے مری آنکھوں کی ٹھنڈک الوداع
الوداع اے روئے انور الوداع
الوداع اے رشکِ یوسف الوداع
حسن کے انمول گوہر الوداع
دائمی غم مجھ کو جانے کا ہے
اے مسرت کے پیمبر الوداع
جا رہا ہوں عرض کرتا الوداع
اے جفا کار و ستم گر الوداع
اے مرے رنگین لمحو الوداع
اے مری رخصت کے منظر الوداع
آج فاتح جانبِ صحرا چلا
الوداع اے ارضِ اخضر الوداع

(''چہرہء ہستی''۔ نظم: الوداع۔ صفحہ 107-108)

شاعر محبوب سے مخاطب ہے کہ تو وہ ہستی ہے جو میری چاہت کا محلِ اظہار ہے۔ تو وہ شوخ و شنگ

موجود ہے جس سے پئے بہ پئے شرارتیں برستی ہیں مگر افسوس کہ تجھے الوداع کہنا پڑا ہے۔تو میرے دل کا قرار اور میری آنکھوں کی ٹھنڈک ہے۔ تیرا چہرہ چمکتا دمکتا ہوا ہے لیکن صد افسوس کہ تجھے خیر باد کہنا پڑ رہا ہے۔اے یوسفِ ثانی میں تجھے خدا حافظ کہتا ہوں۔توحسن و جمال کا ایسا انمول موتی ہے جس کی نظیر اور کہیں نہیں ملتی۔توخوشی کا پیامی ہے۔تجھ سے ملتے ہی نویدِ فرحت مہیا ہوتی ہے۔مگر اب جبکہ تجھ سے جدا ہو رہا ہوں تو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ایک دائمی غم کا شکار ہونے والا ہوں۔لہٰذا میرا الوداعیٔ سلام قبول ہو۔ میں تیری دنیا سے بہت دور جا رہا ہوں۔اگرچہ تو ستم ڈھاتا ہے، جفائیں کرنا تیرا معمول ہے، پھر بھی مجھے تو عزیز از جاں ہے۔ میں نے ایک شاندار وقت تیرے ساتھ گزارا ہے۔اس رنگین سماں کو خدا حافظ کہنے کا وقت آ گیا ہے۔ تیرا کوئے حسین میرے لیے بہارِ آفریں اور حریفِ فردوسِ بریں رہا ہے۔افسوس کہ اب بچھوڑا الوداع کہنے پر مجبور کر رہا ہے۔

کیا کہا جائے کہ ایک مختصر سی نظم جدائی کی سوگواریوں کے ساتھ ساتھ محبوب کی قصیدہ خوانی کے کیسے کیسے پہلو رکھتی ہے۔اس کے حسن و جمال، اس کے پندارِ ذات، اس کے مقامِ دل نشیں اور اس کی کیفیات دل نواز کا سیر حاصل بیان ہے۔الوداع کہنے کی غمگین کیفیت کے ساتھ ساتھ شاعر کی زندہ دلی اس کی رومان افروزی ایک مختصر سی بحر کی نظم میں ایک پردرد ردیف کی ماہیت میں ایک عجیب فضا پیدا کر رہی ہے۔ جیسے آنکھوں میں اشک تیر رہے ہوں اور ہونٹوں پر مسکراہٹ کھیل رہی ہو۔جس سے ہنس ہنس کر کوئی اپنی داستانِ بربادی سنا رہا ہو۔ان کا اپنا ایک مشہور شعر ہے:

تیری بزمِ ناز سے اے مہ جبیں جاتا ہوں میں
ہاں سوائے جانے کے اب چارہ نہیں، جاتا ہوں میں

ایک اور مقام پر لکھتے ہیں:

دلِ فسردہ حقیقتاً آج بین کر کر کے رو رہا ہے
اگرچہ ظاہر میں غم نہیں اگرچہ میں مسکرا رہا ہوں
اتر رہے ہیں مرے دروں میں غموں کے پیکان درحقیقت
مگر بظاہر میں نغمہ ہائے نشاط انگیز گا رہا ہوں

الغرض یہ نظم خود میں لامحدود خوبیاں رکھتی ہے۔اس میں ایک رچاؤ ایک تغزل ہے۔ایک سلاست ہے۔ایک روانی ہے۔ ایک تموج ہے۔شدتِ اظہار ہے۔زورِ بیان ہے۔ایک تسلسل ہے۔ایک سوز و گداز ہے۔ایک وصف نگاری ہے۔ایک تکرارِ لفظی ہے۔موضوع سے گہری وابستگی ہے اور نفسِ مضمون

سے پوری پوری وفاداری ہے۔ لفظیاتی طور پر بھی اور جذباتی طور پر بھی ایک بھرپور رومانی فضا ہے۔ جو اول سے آخر تک دامن گیر رہتی ہے اور قاری کو خود میں جذب کیے جاتی ہے۔

من الحیث المجموع یہ امر پایہء ثبوت کو پہنچتا ہے کہ پروفیسر ظہور احمد فاتح ایک زبردست رومان پرور شاعر ہیں۔ البتہ یہ بات محلِ نظر ہے کہ ان کی شاعری مقدم ہے یا رومان کہنے کا مطلب یہ ہے کہ انہیں شاعری نے رومان بخشا یا ان کے رومان نے انہیں شاعر بنا دیا ہے۔ عام طور پر یہ بات مشاہدہ کی گئی ہے کہ انہوں نے منظومات کے لیے بھی زیادہ تر غزل کی ہئیت کو پسند کیا ہے۔ یہ نکتہ بھی ان کی رومان پسندی کی طرف اشارہ کناں ہے۔ ہم نے بہت سے لوگوں کو یہ بات کہتے ہوئے سنا ہے کہ ان کے ہاں رومان کی قدرتی فضا پائی جاتی ہے۔ ان کا طرزِ رومان فطری نوعیت کا ہے۔ ان کی رومانوی شاعری ایسے تمام پہلوؤں کی احاطہ بندی کرتی ہے جو قبیلِ رومان میں شمار کیے جا سکتے ہیں۔ مثلاً حسن و جمال، ناز و ادا، عشوہ وغمزہ، وصال و مکالمت، کیف و سرور، وجد و مستی، جوش و جنوں، محویت و مجذوبیت، جذب و شوق، فکر و نظر، حال و خبر، عیش و نشاط، تسکین و راحت، لذت و لطف، سکون و خمار، جام و سبو، رند و ساقی، دلبر و دلدار، دل نواز و دل نشیں، گلفر از و گل بدن، لب و عارض، چشم و ابرو، زلف و جبیں، دست و پا، گردن و کمر، رنج و غم، واسوخت، ہجر و فراق اور الوداع۔ یہ تمام ایسی جزیات ہیں جو مل کر ان کے ہاں ایک ایسا عالمِ رومان تشکیل کرتی ہیں جو ہر لحاظ سے مکمل اور ہر اعتبار سے وجد آفریں ہوتا ہے۔ اگر یہ کہا جائے کہ ابوالبیان ظہور احمد فاتح کا رومان دبستانِ دہلی اور دبستانِ لکھنو کی امتزاجی خصوصیات کا حامل ہے تو بے جا نہ ہوگا۔ کہیں اس میں روحِ میر جا گزیں نظر آتی ہے تو کہیں جذبہء آتش بولتا ہوا محسوس ہوتا دکھائی دیتا ہے۔ اس سے بھی ذرا تجاوز کیجئے تو ہمیں کہنے دیجئے کہ اس میں اختر شیرانی والا رچاؤ اور حسرت موہانی والی خود سپردگی مجتمع ہوگئی ہے۔ اس میں ساحر لدھیانوی کی حرماں نصیبی اور فیض احمد فیض کا والہانہ پن پوری رعنائی سے جلوہ گر ہے۔

ابوالبیان ظہور احمد فاتح اور آشوبِ عصر

زمانہ محلِ ممکنات ہے۔ اگر خوشیاں ملتی ہیں تو غم بھی آتے ہیں۔ اگر سکون میسر آتا ہے تو یورشِ اضطراب بھی ہوتی ہے۔ اگر الطافِ جہاں بہم ہوتے ہیں تو آشوبِ دہر سے بھی پالا پڑتا ہے اور جب ان کوائف کا سامنا ہوتا ہے تو خامۂ شاعران کی تصویر کشی بھی ضرورت کرتا ہے۔ بطورِ خاص آشوبِ جہاں کے حوالے کلامِ سخن ور میں لامحالہ آتے ہیں۔ جیسے خواجہ میر دردؔ نے کہا تھا:

زندگی ہے یا کوئی طوفان ہے
ہم تو اس جینے کے ہاتھوں مر چلے

غالبؔ جنہیں حیوانِ ظریف کہا جاتا ہے، وہ بھی چیخ پڑے تھے:

زندگی اپنی جب اس حال سے گزری غالب
ہم بھی کیا یاد کریں گے کہ خدا رکھتے تھے

ساغرؔ صدیقی نے آہِ سرد بھر کر کہا تھا:

زندگی جبرِ مسلسل کی طرح کاٹی ہے
جانے کس جرم کی پائی ہے سزا یاد نہیں

اقبالؔ نے بڑی آزردگی سے کہا تھا:

دنیا کی شورشوں سے اکتا گیا ہوں یا رب
کیا لطف انجمن کا جب دل ہی بجھ گیا ہو

یہاں برجستہ طور پر ابوالبیان ظہور احمد فاتح کا یہ شعر یاد آ رہا ہے:

سسکیوں کے گیت گاؤ قہقہوں کے ساز پر
امتزاجِ رنج و راحت ہے نوائے زندگی

اس شعر کی خاص بات یہ ہے کہ زمانے سے جہاں ناہمواریوں کی توقع برمحل ہے، وہاں بھلائی کی امید بھی لگائی جاسکتی ہے۔ یعنی ان کے ہاں بیم ورجا کی کیفیتیں شانہ بہ شانہ سفر کرتی ہیں۔

شذرہ ھٰذا میں ہم ان مقامات کی عکاسی کرنے والے ہیں جو زمانی ومکانی درشتوں، سختیوں اور آلام ومحن سے متعلق ہیں جن سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ دنیا پھولوں کی سیج نہیں ہے۔ بقول ابوالبیان ظہور احمد فاتح:

گوتم نے سچ کہا تھا
دنیا ہے گھر دکھوں کا

شعری مجموعہ ''آئینۂ دل'' ہمارے ہاتھ میں ہے۔ اس کی نظم ''ڈاکٹر نذیر احمد شہید'' کے ابتدائی تین اشعار جو عصری آشوب کے حامل ہیں، ہمارے زیرِ جائزہ ہیں:

آج ہر اک دل غم و اندوہ سے لبریز ہے
آج ہر اک آنکھ روتی اشکِ خوں آمیز ہے
آج ظلم وجور نے چھو لی ہے حدِ انتہا
آج وحشت کے سبب ہر دل کی دھڑکن تیز ہے
اک طرف محشر بپا ہے ہائے ہے کا شور ہے
اک طرف پرنم خموشی کتنی معنی خیز ہے؟

(صفحہ:21)

آشوبِ زمانہ کی کئی جہتیں ہیں۔ ایک ذاتی حوالے سے، دوسری کائناتی حوالے سے۔ یہاں موخر الذکر قسم کے آشوبِ جہاں کا حوالہ ہے۔ ایک شریف النفس انسان جو سچا ہمدردِ ملک وملت بھی ہے، اسے محض حق گوئی کی پاداش میں قتل کر دیا گیا۔ اس غم کو ابوالبیان ظہور احمد فاتح نے اس شدت سے محسوس کیا ہے۔ مندرجہ بالا اشعار ان کی اس کیفیت کے غماز ہیں۔

ان کے شعری مجموعہ ''تصویرِ کائنات'' میں سے بعنوان ''بے دردزمانہ'' سے جو اشعار شامل کیے گئے ہیں، ان میں سے چار اشعار بہ ایں نسبت رقم کیے جاتے ہیں:

کم ہیں ایسے دنیا میں جو مرہم زخم پہ رکھتے ہیں
اکثر دنیا والوں کو بس تیر چلانا آتا ہے
دہر میں امن زبانی ہے اور دل میں آگ کے شعلے ہیں
جنگیں شوق سے ہوتی ہیں اور بم برسانا آتا ہے
دیکھا آخر چین سکوں آرام کا ستیا ناس ہوا
کیوں نہ ہوتا دنیا والوں کو تڑپانا آتا ہے
کب یہ دنیا اک تھوڑی سی آنچ گوارا کرتی ہے
اس کو تو ہر ضرب کے بدلے ضرب لگانا آتا ہے

(صفحہ:46-47)

شعرِ اول میں کسمپرسی کا گلہ کیا گیا ہے کہ چارہ ساز بھی چارہ سازی سے گریزاں ہیں۔ یہاں تو تیر مار کے جاتے ہیں۔ کبھی طنز کے کبھی طعنوں کے کبھی تمسخر کے اور کبھی حقیقی تیر یا تفنگ جو جسم کو چھید کر رکھ دیں۔ دوسرے شعر میں دنیا کی بداعمالی کے حوالے سے بات کی گئی ہے۔ زبانی کلامی تو امن کے بڑے دعوے کیے جاتے ہیں حالانکہ دل میں آگ کے شعلے بھڑک رہے ہوتے ہیں۔ لوگوں کے عمومی رویے تو یہ ہیں کہ لوگ جنگوں کی بات کرتے ہیں اور ہر طرف بم باریاں ہوتی رہتی ہیں۔ تیسرے شعر میں بھی آشوبِ دروں کا رونا رویا جا رہا ہے کہ اس دنیا میں سرور وسکون کٹ کر رہ گیا ہے۔ اہلِ دنیا کی روش یہی ہے کہ لوگ ایک دوسرے کو مارنے اور تڑپانے پر لگے ہوئے ہیں۔ چوتھے شعر میں اہلِ جہاں کی بے صبری اور ناشکیبائی کا تذکرہ کیا گیا ہے۔ وجہ یہ ہے کہ لوگوں کی فطرتِ ثانیہ یہی بنی ہوئی ہے کہ ضرب کے بدلے ضرب لگانے پر آمادہ ہیں۔ رواداری اور درگزر جیسی خوبیاں آج ان میں عنقا ہیں۔

شاعر کے گرد دو خول ہوتے ہیں۔ ایک غمِ ذات کا اور دوسرا غمِ کائنات کا۔ ابوالبیان ظہور احمد فاتح کی یہ خوبی ہے کہ غمِ جاں کی نسبت غمِ دوراں کا کرب زیادہ محسوس کرتے ہیں اور وہ کرب اشعار میں ڈھل کر ان کی انسان دوستی کا منہ بولتا ثبوت ٹھہرتا ہے۔

پروفیسر ظہور احمد فاتح کی کتاب ''ساری بھول ہماری تھی'' میں شامل ان کی نظم ''کتابِ دل'' کی چند آخری سطور ملاحظہ ہوں:

پہلے کچھ روز حرزِ جاں جانا
لمحہ لمحہ سنبھال کر رکھا

بھر گیا جی تو ایک دن اس نے
اس کے اوراق چاک کر ڈالے
اب وہی قیمتی کتابِ دل
پنکھڑی پنکھڑی ہو گل جیسی

(صفحہ:107)

یہاں آشوبِ زمانہ کے ہاتھوں ''کتابِ دل'' کی بریدگی کا ذکر ہے۔ چنانچہ وہ کہتے ہیں کہ کتابِ دل جونہایت قیمتی اور جاذبِ نظر تھی، یارِ جفا کار کے ہاتھ لگ گئی۔ اس نے پہلے تو کچھ دن قدر دانی کا ثبوت دیا لیکن پھر وہ فطری سفاکی پر اتر آیا۔ اس کتاب کے معصوم اوراق چاک کر ڈالے اور اب یہ عالم ہے کہ جیسے گلِ افسردہ پتی پتی ہوکر بکھر جاتا ہے، اسی طرح کتابِ دل بھی ورق ورق ہوکر منتشر ہوگئی ہے۔

نظم ھٰذا میں آشوبِ دل کا بیان ہے جسے جانِ عصر محبوب دلربا نے پارہ پارہ کر دیا ہے اور اس کی حسرت ناک منظرکشی نظمِ ھٰذا میں پائی جاتی ہے۔

آگے چل کر اسی کتاب میں شامل ایک اور بھرپور نظم ''ماں کی دعا'' اپنی طرف ملتفت کر لیتی ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ یہ دعا بھی آشوبِ عصر کے حوالوں سے معمور ہے۔ ذرا آپ بھی پڑھیے:

مجھے رنج و مصیبت سے بچاتی ہے دعا تیری
کڑے طوفان سے بھی کھینچ لاتی ہے دعا تیری
مجھے جب یاس کی تاریکیاں بے تاب کرتی ہیں
شعاعِ نور بن کر مسکراتی ہے دعا تیری
کوئی نخوت کا مارا جب مجھے دھتکار دیتا ہے
تو ممتا بن کے سینے سے لگاتی ہے دعا تیری
مجھے ہلکان کر دیتی ہے جب دکھ درد کی یورش
مری خاطر خوشی کے گیت گاتی ہے دعا تیری
اے میری محسنہ تیری دعا میرا اثاثہ ہے
رلاتا ہے زمانہ تو ہنساتی ہے دعا تیری

(''ساری بھول ہماری تھی''۔ صفحہ:116)

کم و بیش دعا کے اکثر اشعار آشوبِ جہاں کے عکاس ہیں۔ محسوس ہوتا ہے کہ شاعر عصری

ناہمواریوں، دشواریوں اور زیادتیوں سے دوچار ہے۔ دنیا میں اسے رنج و مصائب کا سامنا ہے۔ کڑے طوفانوں میں گھرا ہوا ہے۔ اسے ظلمتِ یاس بے تاب کیے ہوئے ہے۔ کہیں کوئی نخوت کا مارا اسے دھتکار دیتا ہے تو کہیں کوئی پریشانی اسے بے قرار کر دیتی ہے۔ کہیں دکھ درد کی یلغار اسے ہلکان کر ڈالتی ہے تو کہیں زمانہ رلانے لگتا ہے۔ ان حالات میں ماں کی دعا ہے جو وجہِ سکون و قرار بھی ہے اور باعثِ دل بستگی بھی ہے جو شدید گرمی میں ٹھنڈک کا احساس ہے۔ عالمِ حبس میں بہار آفریں جھونکا ہے۔ گویا ماں کی دعائے مہربان کے بین السطور عصری آشوب کا بیان بھی ساتھ ساتھ چل رہا ہے۔

یہاں اس امرِ مستحسن کی داد دینا پڑے گی کہ شاعرِ بزرگ بہ اندازِ طفلی والدہ کی دعاؤں کی ممنونیت کے احساس سے سرشار ہے اور انہیں آشوبِ عصر کا تریاق سمجھ رہا ہے۔ نہایت معصومانہ مگر بلیغ انداز ہے جس میں سپاس گزاری بھی ہے اور ممنونیت شعاری بھی۔ جس میں سوز و گداز اپنے فطری رنگ میں جلوہ گر دکھائی دیتا ہے۔ یہاں وفورِ شعر کے ساتھ ساتھ حساسیت کا گراف بھی اوپر بڑھتا ہوا دکھائی دیتا ہے۔ کہیں بھی ذرا برابر ڈھیلے پن کا احساس نہیں ہوتا ہے۔ اب چاہے ناقدِ ادب اسے آمد سے تعبیر کرے یا کہنہ مشقی کا شاخسانہ قرار دے، دونوں کیفیات برمحل معلوم ہوتی ہیں۔ ابوالبیان ظہور احمد فاتح کے پانچویں مجموعۂ کلام ''سنہرے خواب مت دیکھو'' مطبوعہ دسمبر 2004ء میں شامل نظم ''صدائے کشمیر'' بھی آشوبِ زمانہ کے حوالوں سے معمور ہے مگر یہ آشوبِ زمانہ انفرادی نہیں بلکہ اجتماعی ہے۔ ایک آزادی پسند قوم طلبِ حریت کے نتیجے میں ایک ملک کی ریاستی دہشت گردی کا شکار ہے۔ اس نظم کے چند اشعار قلم بند کر کے ہم انہیں بلا تبصرہ چھوڑے دیتے ہیں۔ آخر قارئین کو بھی کچھ نہ کچھ اظہارِ فہم کرنا چاہیے۔

آج پھر وادیٔ کشمیر صدا دیتی ہے
جس کی رودادِ الم عرش ہلا دیتی ہے
وادیٔ خلد نشاں میں ہیں مظالم برپا
اہلِ کشمیر سے چھینا گیا حق جینے کا
کھیلتا رہتا ہے نت خون کی ہولی ہندو
قتل و غارت گری و جور و وفا ہے ہر سو
آہ! وہ جبر و تشدد کے بھیانک منظر
اف وہ بارود کی بدبو کہ ہے جینا دوبھر
ہائے وہ بے بس و مجبور بناتِ وادی

وہ درندے وہ ہوس ناکی وعصمت ریزی
کہیں لاشیں ہیں لہو رستا نظر آتا ہے
ظلم کی چکی میں دل پستا نظر آتا ہے
گولیوں سے چھدے اجسام ہیں قریہ قریہ
بربریت کا وہ عالم ہے کہ توبہ توبہ
آج ہے تیز بہت ولولہ آزادی کا
ارضِ کشمیر کو ہے سامنا بربادی کا
گرم ہے موت کا بازار حسیں وادی میں
زندگی سخت ہے دشوار حسیں وادی میں
کہیں ماتم کہیں نوحے کہیں غمگین جلوس
وہ شہیدوں کے جنازے وہ لہو رنگ عروس

(صفحہ:56 تا 58)

آپ نے ملاحظہ فرمایا کہ ہر شعر جہانِ الم اپنے دامن میں لپیٹے ہوئے ہے۔ ہر مصرع آشوبِ جہاں کی عکاسی کر رہا ہے۔ ایک ایسا آشوب جس میں پوری ریاست جل رہی ہے۔ ایک ایسا کرب جس میں کم و بیش ایک کروڑ انسان مبتلا ہیں اور ایسی تکلیف جس کی سنگینی دنیا کا ہر باضمیر انسان محسوس کر سکتا ہے۔ ایک ایسی اذیت جس کی تلخی پر منصف مزاج قوم اپنے دل میں پاتی ہے۔ اقبال نے سچ کہا تھا:

شاعرِ رنگیں نوا ہے دیدۂ بینائے قوم

یہ دیدۂ بینا کا کمال ہے جو غمِ ذات و غمِ کائنات کو اپنے اشعار میں یوں مصور کر دیتا ہے کہ کوئی چشمِ بابصارت اور کوئی قلبِ ذی بصیرت جسے محسوس کیے بغیر نہ رہ سکے۔ بقول غالب:

دیکھنا تقریر کی لذت کہ جو اس نے کہا
میں نے یہ جانا کہ گویا یہ بھی میرے دل میں ہے

پایانِ شذرہ یہ عرض کرنا ضروری محسوس ہوتا ہے کہ پروفیسر ظہور احمد فاتح کے ہاں عصری آشوب کے حوالے بہت بڑے پیمانے پر پائے جاتے ہیں۔ اگر ہم ان کا احاطہ کرنے نکلیں تو صرف اسی مقالے کے لیے ایک الگ کتاب درکار ہوگی۔ لہٰذا بطور مشتے از خروارے ہم اسی پر اکتفا کرتے ہیں۔ مطلوب تو یہ ہے کہ کچھ اس کا اندازہ ہو جائے کہ جنابِ فاتح کے ہاں آشوبِ زمانہ کا رنگ کتنا چوکھا اور گہرا ہے۔

ابوالبیان ظہور احمد فاتح کا طلسماتی اندازِ فکروفن

طرزِ نگارش کا انحصار اندازِ فکر پر ہوتا ہے۔ سوچ کی پرتیں جس قدر جاذب و دل نشیں ہوں گی۔ شعر پارے اسی قدر نکھرے نکھرے اور دل کش ہوں گے۔ ابو البیان ظہور احمد فاتح کا اسلوبِ تحریر نہایت دلگداز، پرکشش اور شگفتہ ہے۔ سو اس کا راز یہ ہے کہ ان کا طرزِ فکر بے حد دل نواز اور نظر افروز ہے۔ ان کا سخن خود میں جو مقناطیسیت رکھتا ہے، ان کا واحد سبق طلسماتی اندازِ فکر ہے۔ ذیل میں ہم ان کی مظومات میں سے انتخاب ہدیۂ قارئین کرتے ہیں جس سے ثابت ہوتا ہے کہ ان کی سوچ یقیناً سحر انگیز ہے۔

صورتیں یہ حروفِ ابجد کی
آڑی ترچھی سی مختلف شکلیں
کتنی دلکش ہیں میری نظروں میں
میں کسی کو بتا نہیں سکتا
صورتیں یہ حروفِ ابجد کی
جاں فزا دل نشیں نظر پرور
ہیں نگاہیں جمی ہوئی ان پر
ان سے آنکھیں چرا نہیں سکتا

(شعری مجموعہ ''ساری بھول ہماری تھی''۔ نظم ''صورتیں یہ حروفِ ابجد کی''۔ صفحہ 26)

ایک شخص جس سے محبت کرتا ہے، اس کا ہر انداز بھلا معلوم ہوتا ہے۔ ہر چھب دل کش لگتی ہے۔ ایک شاعر جس کی نسبت حروف کی حرمت سے ہوتی ہے، حرف ہی جس کی کائنات ہوتے ہیں، وہ دل کی اتھاہ گہرائیوں سے حروف سے محبت کرتا ہے۔ صرف یہی نہیں بلکہ انہیں سراہتا ہے۔ ان کی تعریف وتوصیف کرتا ہے۔ یہی معاملہ جنابِ فاتح کے ہاں ہے۔ ان کی فکر ادبیات کی رسیا ہے۔ جبکہ حروف ادبیات کی جان ہیں۔ لہٰذا ان کی یہ فکری اپچ اندازِ بیاں میں در آئی ہے۔ یہ دل نواز منظر کشی جو حروف کے حوالے سے ابوالبیان نے کی ہے، جانِ بیان ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ مناظر کی ایک طلسماتی فضا انہوں نے قائم کر دی ہے جس میں حروف کی اشکال کا تانا بانا بنا ہوا ہے۔ یہ بظاہر آڑی ترچھی سی لکیروں سے ملتی جلتی اشکال حروف خود میں اتنی جاذبیت اور رعنائی رکھتی ہیں کہ بیان سے باہر ہے۔ یہ صورتیں حروفِ ابجد کی کتنی جاں نواز ہیں، کتنی دل نشیں ہیں اور کتنی نظر پرور ہیں، کچھ کہا نہیں جا سکتا۔ لہٰذا نظریں ان پر مرتکز ہیں اور یہ محورِ فکر و فن بنی ہوئی ہیں۔

ہمیں اظہار کا اک اور بھی انداز آتا ہے
وہ اندازِ جلی جو مستند بھی ہے موثر بھی
کہ ہم اہلِ قلم، اہلِ سخن، اہلِ کرامت ہیں
ودیعت ہے ہمیں اشعار کی دنیا کی سلطانی
اگر کچھ شوق شامل ہو اگر کچھ جوش بھی شامل
اگر کچھ ولولہ بھی ہو تو یہ محشر بپا کر دیں
اگر کچھ کرب ہو ان میں اگر کچھ درد ہو ان میں
اگر کچھ سوز ہو ان میں تو یہ تڑپا کے رکھ دیں گے
ہمارے لفظ ناطق ہیں ہمارے لفظ بولیں گے

(''ساری بھول ہماری تھی''۔ نظم 'اظہارِ جلی''۔ صفحہ 38-39)

پہلے حروف کی بات ہو رہی تھی، اب الفاظ کا بازی گر الفاظ کے حوالے سے رقم طراز ہے کہ الفاظ ہی اس کی جاگیر ہیں۔ یہی اس کی متاعِ بے بدل ہے۔ یہی اس کا ذریعۂ اظہار ہیں۔ ذریعۂ اظہار بھی ایسا جو سحرِ سامری کی طرح سر چڑھ کر بولے۔ چنانچہ لکھتے ہیں کہ الفاظ کو ذریعۂ خیال بنانا اظہارِ جلی کا وسیلہ ہے۔ ایک مستند ذریعہ، ایک موثر اسلوب بھی ہے۔ کیوں نہ ہو؟ کہ ہم اہلِ قلم ہیں۔ ہم سخن پرور ہیں اور یہی اپنی کرامت ہے۔ الفاظ کی دنیا ہماری سلطنت ہے۔ ایسا جوہر ہمارے الفاظ میں مضمر ہے اگر ان میں ذوق

وشوق فراواں ہو جائے، کچھ جوش وخروش وافر ہو جائے تو یہ محشر سامانی کر سکتے ہیں۔ ان میں یہ صلاحیت ہے کہ درد وکرب وسوز کے علی الرغم یہ تڑپا کے رکھ دیتے ہیں۔ یہ شبد خاموش نہیں، گونگی تصویریں نہیں، بلکہ قوتِ ناطقہ سے متصف ہیں۔ یہ بولیں گے اور ڈنکے کی چوٹ پر بولیں گے۔

بظاہر الفاظ خاموش تصویریں ہوتی ہیں مگر شاعر کا فطری آہنگ ان میں جان پیدا کر دیتا ہے۔ پھر ان میں مختلف کیفیات ہویدا ہو جاتی ہیں۔ کہیں یہ رقصاں نظر آتے ہیں، کہیں یہ سوزاں محسوس ہوتے ہیں، کہیں یہ چمکتے دمکتے دکھائی دیتے ہیں، کہیں ان سے خوشبو پھوٹتی محسوس ہوتی ہے۔ گویا شاعر کی سحر انگیز فکر انہیں زندگی عطا کر دیتی ہے۔ یہی حضرتِ فاتح کا اعجازِ فن ہے۔

وہ دیکھتا ہے جو میری جانب
تو ایسا لگتا ہے اک زمانہ مری طرف ملتفت ہوا ہے
وہ دیکھتا ہے جو میری جانب
تو ایسا لگتا ہے میں اک طلسمی فضا میں تحلیل ہو رہا ہوں
وہ دیکھتا ہے جو میری جانب
تو ایسا لگتا ہے چشمِ نرگس مجھے فسانے سنا رہی ہے رفاقتوں کے
کنول سی آنکھیں عجب مناظر دکھا رہی ہیں صباحتوں کے
وہ مدھ بھرے نین مجھ کو ساغر پلا رہے ہیں محبتوں کے

(''ساری بھول ہماری تھی''۔ نظم ''محسوسات''۔ صفحہ 57)

ایک سچا سخن ور احساسات کا مرقع پیش کرتا ہے جس میں اس کے عمیق مشاہدات کی عکاسی بھی ہوتی ہے اور قلبی جذبات کی ترجمانی بھی ہوتی ہے۔ جو ایسا بھرپور تاثر قائم کرتی ہے کہ قاری پر عالمِ محویت طاری ہو جاتا ہے۔ مندرجہ بالا اقتباسِ نظم میں شاعر نے کس عمدگی سے نگاہِ محبوب کی ترجمانی کی ہے کہ اس میں کیسی سحر آفرینی ہے۔ کس قدر طلسماتی کیفیت کی حامل چشمِ جاناں ہے۔ کیا کیا کرشمات اس نگاہِ فسوں ساز میں پائے جاتے ہیں جن سے دل کی دنیا تہ و بالا ہو جاتی ہے اور عالمِ دیدہ وقفِ تحیر ہو جاتا ہے۔ اب ذرا یہ نظم پارہ ملاحظہ ہو:

سماں رم جھم کا ہو قوسِ قزح کی جلوہ ریزی ہو
مرے ماحول میں جیسے ہو رنگ ونور کی بارش
مرے ہاں تتلیوں کا جگنوؤں کا رقص جاری ہو

حسیں منظر ہو نظروں میں حنا ہاتھوں میں مہکی ہو
مشامِ جان ابٹن سے معطر ہو
لباسِ سرخ پہنے زیبِ تن زیور کیے گھونگھٹ نکالے
اک عروسِ دل نشیں بیٹھی ہو پہلو میں

(صفحہ:58)

منظر نگاری کا کمال یہ ہے کہ شاعر جب قلم سے اس کی تصویر کشی کرے تو اس پر موقلم کا گمان ہو۔ جیسے اس نے کینوس پر تصویر مرتسم کر دی ہو۔ پیش کردہ پیرایۂ سخن میں ابرو باراں کی منظر کشی کی گئی ہے۔ جس میں پہلے رم جھم ہوتی ہے اور پھر تیز بارش شروع ہو جاتی ہے۔ بارش کے بعد جب جھالا نکلتا ہے تو منظر نکھر جاتا ہے۔ مطلع پر قوسِ قزح جلوہ ریز نظر آتی ہے۔ پھر حشرات فضا میں اڑنے لگتے ہیں۔ تتلیوں اور جگنوؤں کا رقص شروع ہو جاتا ہے۔ ایسے میں دل پر شوق بھی مکمل ترنگ پر ہوتا ہے۔ اس امنگ میں یہ بات بھی ہے کہ نگار شہناز کا روپ اختیار کر لیتا ہے اور عروسِ جاں فزا اپنے بھڑ کیلے ملبوس اور عطر آگیں ماحول کے ساتھ اپنی دلکش اداؤں سے بھرپور دلداری کے لیے موجود محسوس ہوتی ہے۔

مندرجہ بالا رنگ مسرت و وارفتگی کا رنگ تھا۔ اب منظر بدلتا ہے ایک اور نظارہ سامنے آتا ہے جو خود میں سوگواری کا رنگ لیے ہوئے مگر جاذبیت کا وہی عالم ہے۔ ذیل کی سطور ملاحظہ ہوں:

ایک جانب اک مزار مرمریں ابھرا ہوا
پاس اس کے کچھ مرید و معتقد بیٹھے ہوئے
ایک جانب اک مجاور شان سے بیٹھا ہوا
سامنے رکھے ہوئے تعویذ گنڈوں کے نقوش
اک بڑے پنجرے میں کچھ پرندوں کی صدا
اور کچھ محبوس خمروں کی صدائے دردناک
اک طرف میت جنازے کے لیے رکھی ہوئی
سامنے بیٹھے ہوئے اس کے لواحق سوگوار
دل کو افسردہ بنا دیتا ہے ماحولِ مزار

(نظم ''آستانہ'' صفحہ:89)

نظم ھٰذا خود میں ایک بھرپور منظریہ تاثر لیے ہوئے ہے۔ سنگِ مرمر سے بنے ہوئے اونچے مزار

زائرین کے جمگھٹے مجاوروں کی جلبِ زر آستانے میں رکھے ہوئے مختلف پرندوں کے پنجرے اوران سے آئی ہوئی سوگوارسی صدائیں یہ سب کی سب کیفیتیں ایک توانا تحریر کا پتا دیتی ہیں۔

اب اک اورنظم دامنِ دل کھینچ رہی ہے۔محبوب سے بہ اندازِ وارفتگی تخاطب کیا ہے اور اسے یقین دہانی کرانے کی کوشش کی ہے کہ شاعر اپنے محبوب کی عطاؤں اور محبتوں کو فراموش کرنے سے قاصر رہا ہے کیونکہ اس کے نازو انداز ایسے جادواثر ہیں کہ وہ کسی اور کے بارے میں سوچ تک نہیں سکتا۔نظم کی اٹھان دیکھیے:

گل سے کیا غافل رہے گا عندلیب
جب یہ سب ممکن ہے جانِ وفا
کب یہ ممکن ہے بھلادوں میں تجھے؟
بھول جاؤں میں ترا بے لوث پیار
کب یہ ممکن ہے ترا عشق وخلوص
محو ہو جائے مرے ادراک سے
کب یہ ممکن ہے تری یادِ حسیں
دربدر میرے دماغ ودل سے ہو
کب یہ ممکن ہے بھلادوں میں تجھے
بھول جاؤں میں ترا بے لوث پیار

(نظم ’’محالات‘‘۔صفحہ:99)

اس نظم میں شاعر نے زورِ منطق سے کام لیتے ہوئے کلام کو جاذبیت عطا کی ہے۔حبیب سے مخاطب ہوکر یہ یقین دہانی کرائی ہے کہ جس طرح بلبل پھول کو فراموش نہیں کرسکتا ہے، اسی طرح وہ بھی اپنے محبوب کی محبت، اس کے خلوص، اس کی اداؤں اوراس کی گرم جوشی کو کسی طرح بھول نہیں سکتا بلکہ لمحہ بہ لمحہ یہ کوائف یادوں پر کارِ مہمیز کرتی رہتی ہیں۔یہاں تک کہ وہ پل بھر بھی یادِ جاناں سے غافل نہیں ہوسکتا۔

اہلِ دل کے لیے محبوب کی رس بھری آواز، انتہائی جاذبیت رکھتی ہے۔گویا وہ دہان گوش سے ساغرِ مے ریز کے مزے لے رہا ہوتا ہے۔یہی کیفیت مندرجہ ذیل نظم میں بدرجہ اتم پائی جاتی ہے:

نوائے بربط ونے سے بھی شناسا ہوں
بہشت گوش رہی ہے صدائے چنگ ورباب

میں سر ستار کے یکتار کے بھی سنتا ہوں
میں جل ترنگ کی موسیقیت سے واقف ہوں
خدا گواہ کہ آوازِ یار کا ثانی
نہ کوئی گیت نہ سنگیت بن سکا ہرگز
عجیب رس ہے انوکھی مٹھاس ہے اس میں
عجب سرور، عجب انبساط ہے اس میں
وہ کیف و مستی، وہ لطف و نشاط ہے اس میں
میں جب بھی سنتا ہوں دل جھوم جھوم جاتا ہے
ذرا سا اس میں ہے سوز و گداز بھی شامل
جو میرے جذبہء الفت کو تیز کرتا ہے
جنوں کو اور بھی کچھ حشر خیز کرتا ہے
طلسم کرتی ہے کیا کیا یہ مدھ بھری آواز
مرے بغیر یہ کوئی سمجھ نہیں سکتا
صدائے یار سماعت نواز ہے کیا کیا

(''ساری بھول ہماری تھی''، نظم: صدائے سماعت نواز۔ صفحہ: 152-153)

شاعر کا یہ دعویٰ ہے کہ وہ ہر طرح کے سازوں اور ان کی موسیقیت سے خوب آگاہی رکھتا ہے۔ ان میں جو میٹھے میٹھے سر پائے جاتے ہیں، وہ بلا شبہ دل نشیں ہیں مگر جو مٹھاس، جو لذت و راحت محبوب کی دلکش آواز میں ہے، وہ کہیں اور نہیں پائی جاتی۔ کسی نے کیا خوب کہا تھا:

تو نہ آتی تری آواز تو آ ہی جاتی
گھر بھی قسمت سے ترے گھر کے برابر نہ ہوا

بقول فیض اللہ فیض:

اور اک چیز بھی پیتا ہوں میں از جادہء گوش
تری آواز کی مانجھی ہوئی پیتا ہوں

چنانچہ ابوالبیان ظہور احمد فاتح اپنے دوست سے اظہارِ عشق کرتے ہوئے اس کی آواز کی یوں تعریف کرتے ہیں کہ اس میں دنیا جہان کی لذتیں ہیں، مٹھاس ہے، رعنائی ہے، راحت ہے، سرور ہے، کیف و

مستی ہے، سوز وگداز ہے جو جذبۂ دل کے لیے درجۂ اکسیر رکھتی ہے۔ لہٰذا ایسی من موہنی آواز میں کھو جانا دراصل فرحتِ حیات پانا ہے۔

قارئین کرام! بے شمار ایسے مقامات ابوالبیان ظہور احمد فاتح کے شعری مجموعوں میں پائے جاتے ہیں جن میں ان کی فکری وفنی سحر انگیزی کا پتہ چلتا ہے۔ یوں محسوس ہوتا ہے جیسے کوئی بین السطور محو ہوتا جا رہا ہو۔ احساسات کی گہرائی اور گیرائی انسان کو خود میں جذب کر لیتی ہے اور یہ وہ مقام ہے جب شاعر قدرتِ کلام اور ندرتِ بیاں کے باعث طلسماتی انداز کا مالک ہو جاتا ہے۔

ابوالبیان ظہور احمد فاتح کے ہاں نظامِ ترکیبات

علمِ بیان ایک بحرِ بیکراں ہے جو طرح طرح کے صنائع و بدائع سے عبارت ہے۔ اس میں خوبصورت مرکبات کی اپنی شان ہے۔ عمدہ ترکیبات جانِ سخن ہوا کرتی ہیں۔ بڑے بڑے شاعر محاورات پر خصوصی دستگاہ رکھتے ہیں۔لہٰذا امثلہ ومحاورات کا برمحل استخدام قدرتِ کلام کی دلیل ہے۔اگر ہم تجزیاتی جائزہ لیں تو ابوالبیان ظہور احمد فاتح کے ہاں بھی محاورات وترکیبات کا بہت شاندار نظام پایا جاتا ہے۔انہوں نے بڑی چابک دستی سے انہیں برتا ہے اوران کا کلام ان کے باعث کافی پرکشش ہوگیا ہے۔ذیل میں ہم ان شواہد کی مثالوں سے وضاحت کرر ہے ہیں۔

ان کی نظم ''سورج سے خطاب'' جو اقبال کے فارسی کلام کا ترجمہ ہے، اس میں سے چند اشعار بطور استشہادات پیشِ خدمت ہیں:

روشنی تیری ہے رشکِ تابشِ دستِ کلیم
ندیاں ہیں تیری کرنوں کی چمک سے جوئے سیم
پرورش پاتا ہے تیرے فیض سے سوزِ دروں
تیری گرمی سے رگوں میں دوڑتی ہے موجِ خوں
تو سناتا ہے ازل سے مژدۂ صبحِ مراد
اے نقیبِ شادمانی زندہ و تابندہ باد

(''آئینۂ دل''۔صفحہ 31-32)

1۔سورج کی روشنی کورشکِ تابشِ دستِ کلیم قرار دے کرخوبصورت استعاراتی جامہ پہنایااوردہری قسم کی ترکیبات استعمال کر کے قدرتِ کلام کا مظاہرہ کیا ہے۔ دوسرے مصرعے میں ندیوں کی چمک کو مثلِ جوئے سیم قرار دے کرتشبیہات کی ایک عمدہ مثال پیش کی ہے۔

2۔شعرنمبر دوسوزِ دروں کا پرورش پانا ایک بھرپورابلاغ خود میں رکھتا ہے۔دوسرے مصرعے میں موجِ خوں کا مرکب بڑی دلچسپی سے استعمال ہوا ہے اوراس کارگوں میں دوڑنا ایک عمدہ مثال ہے۔

3۔شعرنمبرتین میں مژدہءصبحِ مراد کی دہری ترکیب اپنی ایک خاص شان دکھا رہی ہے۔اسی طرح مصرع ثانی میں نقیبِ شادمانی کی ترکیب بڑی جانداراورزندہ وتابندہ باد کی بندش کافی چست ہے۔

آیئے!اب ایک اورنظم بعنوان ''عالمِ بے یقینی''زیرِمطالعہ لاتے ہیں۔اس کے حسبِ ذیل اشعار قابلِ جائزہ ہیں۔

اے دوست اس کی ہر گھڑی حالت خراب ہے
میں کس طرح کروں دلِ سوزاں کا اعتبار؟
جانے عدم کی راہ پر کس وقت چل پڑے؟
آتا نہیں مجھے غمِ ہجراں کا اعتبار
کب جانے ہجرِ یار میں کب مر کے چل پڑے؟
ہے کیا حیاتِ بلبلِ نالاں کا اعتبار؟
ہے مہرباں کبھی کبھی نامہربان ہے
کیسے کروں طبیعتِ دوراں کا اعتبار؟

(''آئینۂ دل''صفحہ 64)

شعرِاول کے مصرع ثانی میں دلِ سوزاں کی ترکیب استعمال ہوئی ہے جوفطری انداز کی حامل ہے۔ شعرثانی کے مصرع دوم میں غمِ ہجراں کا مرکبِ اضافی بھی اپنی شان دکھا رہا ہے۔شعرِ ثالث کے پہلے مصرع میں ہجرِ یاراوردوسرے مصرع میں حیاتِ بلبلِ نالاں کی دوہری ترکیب لطف دے رہی ہے۔ آخری شعرمیں مہربان ونامہربان کی صفتِ تضاد کے علاوہ طبیعتِ دوراں کا جدید مرکب خاصا دلچسپ ہے۔واضح رہے کہ مندرجہ بالا اشعار میں جوترکیبات آئی ہیں، وہ تصنع سے مبرا محسوس ہورہی ہیں اوران

میں آمد کا رعب پایا جاتا ہے۔

لیجئے ایک اور نظم ''انتظارِ شدید'' کے سرنامہ سے معنون دامنِ دل کھینچ رہی ہے۔

اے مرے پیارے، مرے محبوب کب آئیں گے آپ؟
کب نویدِ فرحت و تریاقِ غم لائیں گے آپ؟
کب شرابِ وصل کی لذت سے بخشیں گے سرور؟
میری اس تشنہ لبی پر رحم کب کھائیں گے آپ؟
کب مرے غمین دل کو آپ بخشیں گے خوشی؟
کب دلِ بے تاب کو تسکین پہنچائیں گے آپ؟
منتظر ہے کب سے یہ نخچیرِ دل صیاد کا؟
کب مرے پیارے نظر کے تیر برسائیں گے آپ؟

(''آئینۂ دل'' صفحہ 75-76)

پہلے شعر کے مصرع ثانی میں دو مرکبات تسلسل سے آئے ہیں اور دونوں برجستہ ہیں۔ ان میں سے پہلا نویدِ فرحت ہے اور دوسرا تریاقِ غم۔ لطف کی بات یہ ہے کہ دو مرکباتِ اضافی مل کر ایک دبنگ مرکبِ عطفی بنا رہے ہیں۔ دوسرے شعر کے مصرع اولیٰ میں شرابِ وصل کی ترکیب ایک روایتی حسنِ کلام ہے۔ اسی طرح مصرع ثانی میں ایک انوکھا مرکبِ توصفی ''تشنہ لبی'' کارفرما ہے۔ شعرِ ثالث میں دلِ بے تاب کا مرکبِ توصیفی وارد ہوا ہے۔ یہ بھی ایک دیرینہ و دل کش مرکب ہے۔ چوتھے شعر میں نخچیرِ دل کا مرکبِ اضافی لایا گیا ہے جو اپنی بہار دکھا رہا ہے۔ مندرجہ بالا مرکبات کے مطالعہ سے ابو البیان ظہور احمد فاتح کا فطری، فکری و فنی، اسلوبیاتی ولسانیاتی تبحر عیاں ہوتا ہے۔

ایک نظم بعنوان ''شہد کی مکھی'' اس وقت ہمارے روبرو ہے جو مرکبات سے مرکب ہے اور اس میں ترکیبات کی عجیب فضا پائی جاتی ہے۔ جس کے باعث نظم کی جاذبیت میں اضافہ ہو گیا ہے۔ ذرا ذیل کے اشعار ملاحظہ ہوں:

شہد کی مکھی ہے اک دلچسپ مخلوقِ خدا
سارے حیوانات سے اس کے خصائل ہیں جدا
اس کی عادت ہے کہ کھاتی ہے سدا رزقِ حلال

یہ رہائش کے لیے تعمیر کرتی ہے مہال
ایک اچھی اور پیاری یہ بھی خصلت اس میں ہے
عادتِ پابندیء نظم و جماعت اس میں ہے
ہے محافظ تو کرے گی سارے گھر کی دیکھ بھال
ہو گا ملحوظِ نظر دشمن کے حملے کا خیال
صبح سے تا شام رہتی ہے یہ سرگرمِ عمل
ایک لمحے کے لیے ہوتی نہیں وقفِ کسل
سعیِ پیہم سے بناتی ہے یہ ایسا انگبیں
جس کی تاثیرِ شفا کا کوئی بھی منکر نہیں
شہد اس کا ہے شفاء الناس کہتے ہیں سبھی
معترف اس کی افادیت کے رہتے ہیں سبھی

(''تصویرِ کائنات''۔صفحہ 69-70)

شعر نمبر 1 میں مخلوقِ خدا بطور مرکبِ اضافی بالکل فطری انداز میں نظر آ رہا ہے۔شعر نمبر 2 کے مصرع اولیٰ میں رزقِ حلال بطور مرکبِ توصیفی وارد ہوا ہے اور یہ بھی بے ساختہ محسوس ہو رہا ہے۔شعر نمبر 3 کے مصرع ثانی میں اولاً دوہری ترکیبیں استعمال ہوئی ہیں جو مرکبِ اضافی سے متعلق ہیں۔ساتھ ہی مرکبِ عطفی بھی وارد ہوا ہے۔یوں نصف سے زائد مصرع مرکبات کی آئینہ بندی کر رہا ہے۔شعر نمبر 4 کے مصرع ثانی میں ملحوظِ نظر کی ترکیب آئی ہے جو عین برجستہ ہے۔شعر نمبر 5 کے دونوں مصرعوں کے آخر میں دو دل کش ترکیبیں لائی گئی ہیں جس کے مصرع اولیٰ کی ترکیب ''سرگرمِ عمل'' بالکل عمومی انداز میں جبکہ مصرع ثانی کے آخر میں ''وقفِ کسل'' جیسی نادر ترکیب لگائی گئی ہے۔شعر نمبر 6 کے دونوں مصرعوں میں ترکیبات اپنی بہار دکھا رہی ہیں۔مصرع اولیٰ میں ''سعیءِ پیہم'' کا مرکبِ توصیفی بالکل سادہ رنگ میں لطف دے رہا ہے جبکہ مصرع ثانی میں ''تاثیرِ شفا'' کا مرکبِ اضافی بڑی شستگی سے قائم کیا گیا ہے۔شعر نمبر 7 کے مصرع اولیٰ میں شفا الناس کی ترکیب خالص عربی انداز میں بطور مرکبِ اضافی لائی گئی ہے۔

یہاں یہ بات بخوبی محسوس کی گئی ہے کہ ابو البیان ظہور احمد فاتح ترکیبات کے وفورِ استعمال کے باوجود اپنے بیان کو حسنِ بیان سے مشابہ رکھتے ہیں اور اسے گنجلک نہیں ہونے دیتے بلکہ بعض اوقات تو ان

کے سخن پر سہلِ ممتنع کا احتمال ہوتا ہے۔

آیئے اب ایک اور نظم اسی تناظر میں زیرِ جائزہ لاتے ہیں۔نظم کا عنوان ''طوائفوں کا گیت'' ہے۔ اس نظم میں بھی نظامِ ترکیبات بھرپور انداز میں برتا گیا ہے:

نہ جس میں عیش و طرب ہو وہ زندگی کیا ہے؟
نہ جس میں پیار کا جذبہ ہو آدمی کیا ہے؟
ہو لذتِ لب و عارض شریکِ لذتِ مے
شرابِ وصل نہ ہو گر تو مے کشی کیا ہے؟
وہ روکتا ہے تمہیں کیوں وصالِ مہ وش سے
جو حور کا نہ ہو طالب وہ مولوی کیا ہے؟
ادا و عشوہ و غمزہ نہ ہو تو حسن نہیں
نہ ہو نگاہ میں شوخی تو دلبری کیا ہے؟
یہی تو سحر ہے تم پر جو کر دیا ہم نے
جو کارگر نہ ہو دل پر وہ ساحری کیا ہے؟

(''تصویرِ کائنات'' صفحہ:72)

شعرِ اول کے مصرع اولیٰ میں عیش وطرب کا مرکبِ عطفی بروئے کار لایا گیا ہے۔شعرِ دوم میں تین ترکیبات اپنی بہار دکھا رہی ہیں۔ پہلے مصرع میں اولاً لذتِ لب و عارض کی دوہری ترکیب آئی ہے جس میں مرکبِ اضافی اور مرکب عطفی ساتھ لائے گئے ہیں۔ یوں ایک دوہرا اور متفرق مرکب وجود میں آیا ہے جو ان کے وسیع تر لسانی تبحر کا غماز ہے۔ایک اور ترکیب ''لذتِ مے'' بطور مرکبِ اضافی لگائی گئی ہے جو بے حد سادہ اور ابلاغ کی حامل ہے۔اسی طرح ایک ترکیب ''مے کشی'' بھی ہے جسے بطور ہیئت مرکبِ فعلی کے طور پر تعبیر کر سکتے ہیں۔شعر سوم میں وصالِ مہ وش بطور مرکب اضافی آیا ہے۔شعرِ چہارم میں ادا وعشوہ وغمزہ کا دوہرا مرکبِ عطفی شانِ دل آویزی لیے ہوئے ہے۔شعرِ پنجم میں ایک مختصر سی ترکیب کارگر ہے جسے ہم ترکیبِ فاعلی سے موسوم کر سکتے ہیں۔

دراصل ترکیبات کی یہ سادگی، برجستگی اور شستگی اس امر کا بین ثبوت ہے کہ سخن ور سہولت سے شعر کہنے پر قادر ہے جسے ہم صرفی ونحوی کفایت شعاری پر محمول بھی کر سکتے ہیں۔جس سے کا، کی، کے جیسے

حروف سے قدرتی بچت ہو جاتی ہے۔ فکری اعتبار سے غیر ضروری کلام کا وجود بھی عنقا ہے اور یوں سخن میں حسن بھی پیدا ہو جاتا ہے۔ یہاں یہ امر قابلِ ذکر ہے کہ یہ ترکیبات ادب آموزی کے وسیع تر خصائص خاصے موثر انداز میں رکھتی ہیں۔ جن میں تلامذہ ءادب کے لیے اکتسابِ ہنر کا سامان موجود ہے۔

یہاں ایک اور نظم ''علاج'' زیرِ نظر ہے۔ اس کے اشعار میں متعدد مرکبات قلم بند ہوئے ہیں جن کے باعث یہ نظم لازوال ادبی سرمائے کا حصہ ہوگئی ہے:

تو اگر کر دے مرے اس قلبِ سوزاں کا علاج
خود بخود ہو جائے گا پھر ظلمِ دوراں کا علاج

اے مرے رشکِ مسیحا دلربا تیرے بغیر
غیر ممکن ہے مری بیماری ءِ جاں کا علاج

باعثِ کیف و سکون و لطف ہے تیرا وصال
تیرا آ جانا ہے گویا دردِ ہجراں کا علاج

باوجودِ کوششِ پیہم نہ ہم سے ہو سکا
تیری فرقت میں ہماری چشمِ گریاں کا علاج

تو جو آئے تو مرے محبوب شاید ہو سکے
میرے بے اندازہ گہرے زخمِ پنہاں کا علاج

(''تصویرِ کائنات''۔ صفحہ:85)

شعرِ اول کے پہلے مصرع میں قلبِ سوزاں کی ترکیب بطور مرکبِ توصیفی برتی گئی ہے جسے حال سے بھی تعبیر کیا جا سکتا ہے۔ اسی طرح دوسرے مصرع میں ظلمِ دوراں کی ترکیب بطور مرکبِ اضافی لائی گئی ہے۔ لطف کی بات یہ ہے کہ شعر ھذا کے قوافی میں ترکیبی حسن بھی پایا جاتا ہے۔ شعرِ دوم کے مصرع اول میں رشکِ مسیحا کی دل نشیں ترکیب ازراہِ تشبیہ لائی گئی ہے۔ اسی طرح مصرع دوم میں بیماری ءِ جاں کی ترکیب ازراہِ مرکبِ اضافی بروئے کار لائی گئی ہے۔ شعرسوم کے مصرع اول میں دہرا مرکبِ عطفی استعمال کیا گیا ہے۔ مزے کی بات یہ بھی ہے کہ تینوں اجزائے ترکیبی باہم مترادف و مربوط بھی ہیں۔ اسی طرح اس شعر کے مصرع دوم میں ایک اور ترکیب برتی گئی ہے اور وہ ہے مرکبِ اضافی۔ شعرِ چہارم کے مصرع اول میں دوہری ترکیب وارد ہوئی ہے جسے ہم مرکبِ اضافی کے زمرے میں لا سکتے ہیں۔ مصرع

ثانی میں ''چشمِ گریاں'' کی ترکیب بطور حال یا مرکبِ توصیفی قلم بند کی گئی ہے۔ مذکورہ بالا ترکیبات رومانوی مزاج کی حامل ہیں جن میں جمالیاتی تاثر بھی پایا جاتا ہے۔

آگے چلتے ہیں تو ایک اور نظم ''التجا'' کے سرنامے کے ساتھ ہماری منتظر ہے۔ اس کے اشعار بھی ترکیبات سے مالا مال ہیں۔ ذیل میں چند شعر ملاحظہ ہوں:

تو گیا جب سے یہاں سے حال سے بے حال ہوں
قابلِ تیماری ہے یہ میرا حالِ زار
مرغِ بسمل ماہیٔ بے آب کی مانند ہوں
چند لمحوں میں کیے دیتا ہوں اپنی جاں نثار
جلد آ اے پیکرِ مہر و وفا، ہاں جلد آ
دیر سے آنے سے ہو گی بے وفائی آشکار
آ کہ فاتح کشتۂ فرقت بلاتا ہے تجھے
سنِ قریبِ مرگ بیمارِ محبت کی پکار

(''تصویرِ کائنات''۔ صفحہ 92)

پہلے شعر کے دوسرے مصرع میں قابلِ تیمار داری جیسی وزن دار ترکیب روبہ عمل لائی گئی ہے جو مرکب اضافی کی نوعیت سے ایک انوکھی ترکیب ہے۔ دوسرے شعر کے پہلے مصرع کے آغاز میں ہی دو مسلسل تراکیب دامنِ توجہ کھینچ رہی ہیں اور وہ ہیں 'مرغِ بسمل و ماہیٔ بے آب''۔ یہ دونوں مرکبات مرکب توصیفی کے حوالے سے عاشق کی بے قراری کا مبالغانہ اسلوب رکھتے ہیں۔ تیسرے شعر کے پہلے مصرع میں ایک دلچسپ ترکیب پیکرِ مہر و وفا کا صدور ہوا ہے جو مرکبِ اضافی اور مرکب توصیفی کے دونوں مزے رکھتا ہے۔ آخری شعر کے دونوں مصرعے ترکیبات سے مملو ہیں۔ پہلے مصرع میں کشتۂ فرقت کی ترکیب لگائی گئی ہے جو ہجر کی سنگینی کی بھرپور آئینہ بندی کر رہی ہے۔ اسی طرح دوسرے مصرعے میں قریبِ مرگ کی ترکیب از راہِ مرکبِ اضافی بروئے کار لائے ہیں۔ عام طور پر لوگ قریب المرگ بطور مرکب استعمال کرتے ہیں جو غلط العام ہے۔ ابوالبیان ظہور احمد فاتح نے بین السطور اس کا درست استعمال اجاگر کیا ہے۔

علیٰ ھٰذا القیاس جس نظم کو بھی دیکھیے، سرمایۂ ترکیبات اپنے دامن میں لیے ہوئے ہے جن میں تصنع

نہیں بلکہ فطری چاشنی ہے۔جن میں بناوٹ نہیں بلکہ بے ساختگی ہے۔ابوالبیان ظہور احمد فاتح کا وفورِ شعر مسلم ہے کہ لکھتے ہیں تو قلم برداشتہ لکھتے چلے جاتے ہیں۔قدرت نے انہیں بے کراں لسانی تبحر سے نوازا ہے۔یہی وجہ ہے کہ ایک اندازے کے مطابق ان کی نگارشات کی تعداد دس ہزار سے زائد ہے اور ان کے اشعار کا شمار اسی ہزار سے مستزاد ہے۔وہ شاعر ہفت زبان ہیں۔یعنی اردو، سرائیکی، پنجابی، ہندی، عربی، فارسی اور انگریزی میں یکساں سہولت سے لکھتے ہیں۔قدرت نے انہیں فکری ترفع اور الفاظ کی دستگاہ ودیعت فرمائی ہے۔بطورِ خاص جن زبانوں کی اردو میں زیادہ سانجھ ہے، ان میں انہیں بہت زیادہ رچاؤ حاصل ہے۔ہنوز بے شمار منظومات ترکیباتی تناظر میں منتظرِ تجزیہ ہیں۔شذرہ کی طوالت کے احتمال کے پیشِ نظر مندرجہ بالا چند نظموں پر ہی اکتفا کیا جاتا ہے کیونکہ کتاب کی گنجائش اسی کی متقاضی ہے۔البتہ وسیع تر لسانی استخدام کے زیرِ موضوع کچھ مزید منظومات کو بھی ہم اسی حوالے سے شاملِ جائزہ کریں گے تاکہ کسی قسم کی تشنگی کا احساس باقی نہ رہے۔

ابوالبیان ظہور احمد فاتح کے تشبیہاتی آفاق

کلامِ شاعر ایک ایسا پیرہن ہوتا ہے جو گوناگوں اوصاف سے مملو ہوتا ہے۔ علمِ بیان کی روشنی میں اگر ہم اس کا جائزہ لیں تو طرح طرح کی خوبیاں ذوقِ لطیف کو نوازتی نظر آتی ہیں جنہیں عرفِ عام میں صنائع بدائع کہا جاتا ہے۔ ایسے ہی فنی تلازمات میں سے ایک نظامِ تشبیہات بھی ہے۔ عام طور پر ایک چیز کی کسی صفت کو دوسری چیز کی ویسی ہی خوبی سے مشابہ قرار دینے کو تشبیہہ کہا جاتا ہے۔ جس کے اجزا میں مشبہ، مشبہ بہ، حروفِ تشبیہہ اور وجہِ شبہ وغیرہ شامل ہیں جنہیں ارکانِ تشبیہ بھی کہا جاتا ہے۔ کسی شاعر کے ہاں سلسلۂ تشبیہات جتنا زیادہ مضبوط اور وافر ہوگا، اس کی قدرتِ کلام اور ندرتِ بیان ویسی ہی توانا ہوگی۔ اس حوالے سے اگر ہم ابوالبیان ظہور احمد فاتح کے سخنِ بسیط کا جائزہ لیں تو ہمیں معلوم ہوگا کہ ان کا کلام اس حوالے سے بے حد زرخیز واقع ہوا ہے۔ ہم اپنی بات کی تائید میں ان کے مطبوعہ شعری مجموعوں میں مشمولہ منظومات میں سے چند اشعار بطورِ استشہاد لا رہے ہیں جس سے یہ اندازہ ہوگا کہ وہ تشبیہات نگاری میں کس قدر یدِ طولیٰ رکھتے ہیں۔

پہلے ''آئینۂ دل'' میں سے جو ان کا پہلا مجموعۂ کلام ہے، کچھ اشعار ملاحظہ ہوں:

یہ جہاں اک روز فردوسِ نظر ہو جائے گا
ذرہ ذرہ صورتِ شمس و قمر ہو جائے گا

(ایک خوش آئند تصور۔ صفحہ 46)

دل کش رات میں ننھا تارا اس انداز میں چمک رہا ہے
جیسے الھڑ دوشیزہ کو گبھرو آنکھیں مار رہا ہو
اودے بادل کے آنچل میں ایسے چاند چھپا جاتا ہے
جیسے کہنہ مشق جواری جیتی بازی ہار رہا ہو

(وصال کی رات۔صفحہ 66)

دریا کے بہتے پانی پر یوں رقصاں ہیں چاند کی کرنیں
جیسے ننھے منے تارے آنکھ مچولی کھیل رہے ہوں
اٹھتی گرتی مضطر موجیں اس انداز سے محوِ سفر ہیں
جیسے ورزش کے میدان میں کچھ فوجی ڈنٹر پیل رہے ہوں
خنک ہوا میں ننھے جگنو کس خوبی سے چمک رہے ہیں؟
جیسے پراسرار سے اڑتے دیپ فضا میں افروزاں ہوں

(وصال کی رات۔صفحہ 67)

دنیا بشر کے واسطے مانندِ کشت ہے
دوزخ ہے اس کا ماحصل یا پھر بہشت ہے

(ایمان۔صفحہ:68)

تیرے ابرو ہلال جیسے ہیں
چہرہ ماہِ کمال ہے تیرا

(تیرے آگے سوال ہے تیرا۔صفحہ:80)

شعرِ اول میں ''ذرہ ذرہ صورتِ شمس وقمر ہو جائے گا'' ایک عمدہ صنعتِ تشبیہ ہے جس میں تشبیہ کا عمومی انداز نہیں بلکہ خصوصی انداز اختیار کیا گیا ہے کیونکہ عمومی انداز میں جیسا یا مثل یا سا استعمال ہوتا ہے جبکہ یہاں ''صورتِ شمس وقمر'' جیسے ترکیبی انداز میں تشبیہ برتی گئی ہے۔ شعرِ دوم میں دونوں مصرعوں کے تال میل سے صنعتِ تشبیہ معرضِ وجود میں آئی ہے۔ ننھے تارے کی جھلملاہٹ کسی گبھرو کی آنکھیں مارنے کی کیفیت سے مشابہ قرار دیا گیا ہے۔ شعرِ سوم میں شعرِ دوم جیسا فطری تسلسل ہے۔ دونوں مصرعے مل کر ایک صنعتِ تشبیہ ترتیب دیتے ہیں۔ چاند کے پسِ ابر رفتہ رفتہ چھپے جانے کی کیفیت کو کسی مشاق جواری کے

دھیرے دھیرے بازی ہارنے سے مشابہ ٹھہرایا گیا ہے۔ان دونوں اشعار میں فطری مظاہر کی مشابہت انسانی حوالوں سے پیش کر کے سخن ور نے ندرتِ بیاض کا ثبوت دیا ہے۔شعرِ چہارم کی کیفیت شعر دوم و سوم جیسی ہے۔ یہاں دونوں مصرعوں کے ملاپ سے صنعتِ تشبیہ کا یقین ہو رہا ہے کیونکہ چاند کے کرنوں کے بہتے پانی پر رقص کو ننھے منے تاروں کے آنکھ مچولی کھیلنے سے مشابہ قرار دیا گیا ہے۔ یہاں البتہ یہ فرق ضرور ہے کہ دونوں اطراف مظاہرِ فطرت کا حسن کارفرما ہے۔شعرِ پنجم میں حسبِ سابق تسلسل برقرار ہے۔ ایک قدرتی منظر کو انسانی کیفیات سے تشبیہ دیتے ہوئے افتاں وخیزاں امواجِ مضطر کو میدانِ جوش میں عساکر کے بیٹھکیں لگانے سے مشابہ قرار دیا گیا ہے۔شعرِ ششم میں پھر ایک بار فطری رنگ کو انسانی تحرک سے تشبیہ دی گئی ہے۔ یہاں بھی دونوں مصرعے مل کر صنعتِ تشبیہ کی تشکیل کر رہے ہیں۔ بڑے دلچسپ انداز میں چکوروں کے فضا میں چکر کاٹنے کو عشاق کے کوئے جاناں کے گرد طواف سے مشابہت دی گئی ہے۔شعرِ ہفتم حسبِ معمول ایک عمدہ صناعی کا مظہر ہے جس میں مصرع اول اور مصرع ثانی کی ملاقات کے نتیجے میں ایک خوبصورت تشبیہاتی رنگ برتا گیا ہے۔ چنانچہ ٹھنڈی ہوا میں ننھے جگنو کے چمکنے کو پراسرار اڑتے ہوئے فروزاں چراغوں سے تشبیہ لایا گیا ہے اور ایک مافوق الفطرت کیفیت ظہور میں لائی گئی ہے۔نظم ''وصال کی رات'' اسی قسم کی خصوصی تشبیہات سے مالا مال ہے جس سے شاعر کی فنی چابکدستی اور موضوع کو دلکش مشابہاتی انداز میں باور کرانے کی بھرپور استعداد کا مظاہرہ ہوتا ہے۔شعرِ ہشتم کے مصرع اولیٰ میں ایک بلیغ فکر مختصر تشبیہ ترجمانی کی گئی ہے جیسے ارشادِ نبوی ہے کہ دنیا آخرت کی کھیتی ہے۔گویا صنعتِ تشبیہ کے ساتھ ساتھ صنعتِ تلمیح بھی روبکار لائی گئی ہے۔اسے کہتے ہیں کہ ایک ٹکٹ میں دو مزے ہیں۔شعرِ نہم میں جو چھوٹی بحر میں سہلِ ممتنع ہے، مصرع اول خود میں ایک نادر تشبیہ سموئے ہوئے ہے۔ چنانچہ محبوب کے ابرو کو ہلالِ نو سے مشابہت دی گئی ہے جو حسنِ انسانی کا حسنِ فطرت سے تشابہ ہے جسے مصرع ثانی کی استعاراتی قرینہ کاری نے اور زیادہ دلچسپ بنا دیا ہے۔

آیئے، اب ابوالبیان ظہور احمد فاتح کے ایک اور موقر مجموعہ کلام ''ساری بھول ہماری تھی'' مطبوعہ جنوری 2003ء میں مشمولہ کچھ منظومات کی تشبیہات کا جائزہ لیتے ہیں۔

نظم ''کتابِ دل'' ہمارے روبرو ہے۔اس میں شامل تشبیہات پر مبنی چند سطور دیدنی ہیں:

تھی بہت قیمتی کتابِ دل
جاذبیت بلا کی رکھتی تھی

آ گئی ہاتھ ایسے خودسر کے

جس کی سب عادتیں تھیں بچوں سی

(صفحہ:107)

کتابِ دل جو بہت قیمتی اور خوب صورت تھی، ایسے محبوب کے ہاتھ لگ گئی جو سخت خودسر بھی ہے اور بچوں جیسی عادتیں بھی رکھتا ہے۔ محبوب کو بچوں جیسی فطری تشبیہ دی گئی ہے جس میں وہ سب کیفیات آ جاتی ہیں جو ایک بچے میں پائی جاتی ہیں۔

پایانِ نظم کی چند اور سطور ملاحظہ ہوں جو نظم کو کلائیمکس پر پہنچا دیتی ہیں اور قاری کا تجسس فزوں تر ہو جاتا ہے:

اب وہی قیمتی کتابِ دل

منتشر ہے ورق ورق ایسے

پنکھڑی پنکھڑی ہو گل جیسے

(صفحہ:107)

ان سطور میں ''کتابِ دل'' کے انتشار کو ایک گل کے پنکھڑی پنکھڑی ہو کر بکھر جانے سے تشبیہ دی جا رہی ہے جو ایک فطری مگر پریشان کن عمل ہے۔ اس میں ایک گہری فکری بالیدگی کارفرما ہے جو تاثر کو بے حد گہرا کر دیتی ہے۔ ایک عجیب سوگواری کا احساس ہوتا ہے۔

اب ایک اور نظم ''صورتیں یہ حروفِ ابجد کی'' اپنی طرف متلفت کر رہی ہے جو ایک عجیب کیفیت کی نظم ہے۔ ایسا موضوع ہے جسے غالباً پہلی بار چھوا گیا ہے۔ ابتدائی چند سطور ملاحظہ ہوں:

صورتیں یہ حروفِ ابجد کی

آڑی ترچھی سی مختلف شکلیں

کتنی دلکش ہیں میری نظروں میں

میں کسی کو بتا نہیں سکتا

(صفحہ:26)

ابجد کی شکلوں کو آڑی ترچھی لکیروں سے تشبیہ دے کر حروف کو جیومیٹریکل اشکال سے مشابہ کیا جا رہا ہے جس سے ایک دلچسپ تشابہ مترشح ہو رہا ہے۔

اسی کتاب میں ایک اور نظم ''فرسودگی'' سے معنون اپنی طرف متوجہ کرا رہی ہے کیونکہ یہاں بھی صنعتِ تشبیہ کا استعمال خوب برمحل ہے۔ اشعار ملاحظہ ہوں:

ہمارے جسم جزیرے کا حال مت پوچھو
کٹا پھٹا ہے یہ دن رات کے کٹاؤ سے
ہے اس پر سلسلہ آتش فشاں پہاڑوں کا
ابلتا رہتا ہے دن رات جن سے لاوا سا

(صفحہ:48)

شاعر نے جسم کو جزیرے کا استعارہ پہناتے ہوئے لہروں کے کٹاؤ اور آتش فشاں پہاڑوں کے عمل سے شدید فرسودگی کا شکار قرار دیا ہے اور اس پر ٹوٹنے والے عذابات کو آتش فشاں لاوے سے تشبیہ دی ہے جس کی زد میں جو کچھ آتا ہے، تہس نہس ہو جاتا ہے۔

ایک اور نظم ''محسوسات'' زیرِ نظر ہے۔ گہرائی و گیرائی کی حامل ہے۔ اس نظم میں بھی نظامِ تشبیہات بلیغ انداز میں موجود ہے۔

وہ مجھ سے ہوتا ہے جب مخاطب
تو ایسا لگتا ہے میرے کانوں میں گھنٹیاں جیسے بج رہی ہوں
وہ بولتا ہے تو ایک امرت سا گھولتا ہے
وہ میرے پاس آ بیٹھے تو یوں محسوس ہوتا ہے
کہ جیسے چودھویں کا چاند میرے گھر میں اتر آیا ہو

(صفحہ:57-58)

نظم کے دو حصے یہاں پیش کیے گئے ہیں۔ پہلے حصے میں تین سطور ہیں جن میں شاعر اپنے احساساتِ قلبی کا یوں اظہار کرتا ہے تو ایسا لگتا ہے کہ جیسے کانوں میں امرت گھول رہا ہو۔ اس کی دل کش آواز کانوں میں رس گھول رہی ہے اور سرور و سکون کی صوتیں کھول رہی ہے۔

اسی طرح نظم کے دوسرے حصے کی دو سطور میں بھی خوب صورت تشبیہ استعمال میں لائی گئی ہے جو روایت کا حسن میں خود میں سموئے ہوئے ہے۔ محبوب کو چودھویں کے چاند سے ابوالبیان تشبیہ دے رہے ہیں۔

پروفیسر ظہور احمد فاتح کی ایک اور کتاب ''سنہرے خواب مت دیکھو'' مطبوعہ دسمبر 2004ء ہمارے زیرِ نظر ہے۔ اس میں شامل نظم ''ہمارا تن کھوکھلا تنا ہے'' میں سے چند سطور تشبیہات کی حامل ہیں جن کو ہدیہء قارئین کیا جاتا ہے:

مہیب سا تھا وجود اپنا
مگر ہوا جرمِ عشق ہم سے
بکھرتا جاتا ہے راکھ بن کر
مثالِ ساحل تھا جسم اپنا
دکھوں کی لہریں، غموں کی موجیں
جو ہم پہ یلغار کر رہی ہیں
انہی تھپیڑوں میں بہہ گئی ہے بدن کی مٹی

شاعر اپنے جسم کو پر ہیبت وجود سے تشبیہ دے رہا ہے لیکن جرمِ عشق کی پاداش میں وہ جل جل کر راکھ ہوا جا رہا ہے اور راکھ ہے کہ اڑتی چلی جا رہی ہے۔ گویا قرینِ قیاس یہ ہے کہ اب کچھ باقی نہیں بچے گا۔ آخری چار سطور میں ایک اور بھرپور تشبیہ لائی گئی ہے۔ چنانچہ ان کا کہنا ہے کہ ہمارا بدن ساحل مثال تھا لیکن اس پر امواجِ دردوغم کی ایسی مسلسل یلغار ہوتی رہی ہے کہ لہروں کے لگاتار کٹاؤ کے باعث جسم کی مٹی بہتی چلی جا رہی ہے اور از راہِ قیاس کہا جا سکتا ہے کہ رفتہ رفتہ کچھ بھی باقی نہیں رہے گا۔ واضح رہے کہ ساحل کی تشبیہ خود میں ایک زبردست ابلاغ رکھتی ہے۔

ابوالبیان ظہور احمد فاتح کے ایک اور مجموعہء کلام ''تصویرِ کائنات'' مطبوعہ 2013ء میں مشمولہ نظم ''خواب اور حقیقت'' کے درمیان ایک دلکش تشبیہ اپنی طرف متوجہ کرا رہی ہے۔

تھا سماں خلدِ نظر صبحِ درخشاں ایسا
میں نے تو خواب میں دیکھا تھا گلستاں ایسا

شاعر کہتا ہے کہ میں نے تو ایک ایسا خواب دیکھا جو صبحِ درخشاں کی طرح جنت نگاہ تھا یعنی جیسے روشن سحر کے نمودار ہوتے ہی ظلمتیں سیماب پا ہو جاتی ہیں، پریشانیاں کافور ہو جاتی ہیں اور دردوغم عنقا ہو جاتے ہیں۔ مزے کی بات یہ ہے کہ یہاں مشبہ اور مشبہ بہ دونوں ترکیبات کی صورت میں ہیں۔ اول الذکر یعنی خلدِ نظر یعنی مرکب اضافی اور موخر الذکر یعنی صبحِ درخشاں مرکبِ توصیفی ہے۔ ایک ہی مصرع میں ایک

صنعتِ تشبیہ اور دو متنوع مرکبات ان کی لسانی چابکدستی نیز فنی عظمت کی عمدہ دلیل ہیں۔

اسی شعری مجموعے کی ایک اور رومانوی نظم ''منہ بولتی تصویر ہے تو عظمتِ فن کی'' میں سے ایک شعر جو صنعتِ تشبیہ سے آراستہ ہے، پیشِ خدمت ہے۔

یوں ہے ترا پرتو میرے افکار میں پیارے
ہو جیسے بہاراں کسی گلزار میں پیارے

شعرِ ھٰذا میں دل کے ٹوٹے درپن میں محبوب کے حسن کا پرتو یوں جلوہ ساماں ہے جیسے کسی گلستاں میں فصلِ گل چمن آرائی کر رہی ہو اور ہر طرف غنچے کھلے ہوئے ہوں اور پھول خوشبو لٹا رہے ہیں۔

شاعری کے بحرِ ذخار میں سے معدودے چند نظمیات میں شامل تشبیہات بطور استشہاد پیش کی گئی ہیں اور طوالتِ شذرہ سے گریز کرتے ہوئے انہیں مثالوں پر اکتفا کیا جاتا ہے ورنہ ابوالبیان ظہور احمد فاتح کے ہاں تشبیہات کی فراوانی ہے اور انصاف کی بات تو یہ ہے کہ ان کے ہاں منظومات سے کہیں زیادہ تشبیہات غزلیات میں پائی جاتی ہیں۔

مشقِ سخن تو بہت سے سخن ور کرتے ہیں مگر دامنِ شعر کو خوبصورت و دلکش تشبیہات سے آراستہ و پیراستہ کرنا ہر کسی کے بس کا روگ نہیں ہے۔ یہ کارنامہ تو پروفیسر ظہور احمد فاتح جیسے کہنہ مشق اور اہلِ ریاض شاعر ہی کر سکتے ہیں۔ لہٰذا ہمیں یہ رقم کرنے میں کوئی باک نہیں کہ جہاں جنابِ فاتح نے حسنِ تشبیہات سے گلشنِ بیاں کو پرکار کیا ہے وہاں انہوں نے علم البیان کی مقتضیات کی بھرپور پذیرائی کی ہے۔ جس سے یہ اندازہ بخوبی لگایا جا سکتا ہے کہ جہاں ایک طرف وہ کلام کی رعنائیوں اور خوشگواریوں کے علم بردار ہیں، دوسری طرف وہاں ایک مشاق اہلِ سخن کی حیثیت سے تلامذہء ادب و ناقدین و محققین کے لیے ایک نابغہ آموزگار بھی ہیں۔

ابوالبیان ظہور احمد فاتح کا آئینۂ استعارات

محاسنِ شعر و سخن میں ایک پسندیدہ وصف استعارہ بھی ہے جسے علم البیان میں بنیادی اہمیت حاصل ہے۔ دراصل ایک چیز یا ایک شخصیت سے اس کا کوئی وصف مستعار لے کر کسی اور چیز یا شخصیت کو دے دینا، استعارہ کہلاتا ہے۔ جس سے کوئی وصف مستعار لیا جاتا ہے، اسے مستعار منہ اور جس کے لیے مستعار لیا جاتا ہے اسے مستعار لہ کہا جاتا ہے مثلاً ''شمیم چاند ہے'' میں شمیم مستعار لہ اور چاند مستعار منہ ہے جبکہ چاند کی خوبصورتی استعارہ ہے۔

ایک شاعر جتنا مشاق اور فنی دستگاہ رکھنے والا ہوگا، اس کے اشعار میں استعارات اسی خوبی اور کثرت سے دستیاب ہوں گے۔ اسی تناظر میں آج ہم ابوالبیان ظہور احمد فاتح کے آئینۂ استعارات کا جائزہ لے رہے ہیں۔ جنابِ فاتح کے کلام کا مطالعہ کرتے ہوئے یہ امر مترشح ہو جاتا ہے کہ ان کے ہاں استعارات کا ایک توانا نظام موجود ہے۔ دورانِ مطالعہ جگہ جگہ خوب صورت استعارات ان کے ہنر کی شوکت میں اضافہ کرتے دکھائی دیتے ہیں۔ ان کی طبیعت کو استعارات سے ایسی موزونیت حاصل ہے کہ ان کے لائے جانے والے استعارات بالکل برجستہ اور فطری محسوس ہوتے ہیں۔ ان کی فنی جرٔت ایسی دلکش ہے کہ قاری سحرِ استعارات میں کھو کر رہ جاتا ہے۔ ذیل میں ہم ان کے دو شعری مجموعوں ''ساری بھول ہماری تھی'' مطبوعہ جنوری 2003ء اور ''سنہرے خواب مت دیکھو'' مطبوعہ دسمبر 2004ء میں سے منتخب نظمیاتی مواد شاملِ شذرہ کر رہے ہیں جس سے بخوبی اندازہ ہو جائے گا کہ ابوالبیان ظہور احمد فاتح کا

کلام ایک مخزنِ استعارات ہے جو ان کے فنی قدوقامت میں اضافہ کرتا ہوا محسوس ہوتا ہے۔

صورتیں یہ حروفِ ابجد کی
خط کشش، نیم دائرے، قوسیں
یہ شعاعیں ، یہ نور کی کرنیں
ان سے نظریں چرا نہیں سکتا
صورتیں یہ حروفِ ابجد کی
زندگی ان سے ہے ، روشنی ان سے
روپ ان سے ہے زندگی ان سے
ان کی چاہت چھپا نہیں سکتا
صورتیں یہ حروفِ ابجد کی
جو ہیں عنوان میری ہستی کا
جو ہیں سامان میری ہستی کا
ان کو فاتح بھلا نہیں سکتا

(''ساری بھول ہماری تھی''۔نظم ''صورتیں یہ حروفِ ابجد کی''۔صفحہ 26)

یہ ایک امرِ واقعی ہے کہ شاعر پیکرِ دانش ہوتا ہے۔علم و ادب سے اس کی محبت والہانہ ہوتی ہے۔وہ حرف کی حرمت کا قائل ہوتا ہے اور شبدوں سے سچا پیار کرنے والا ہوتا ہے۔ظہور احمد فاتح کی یہ نظم ایک معرکۃ الآرا نگارش ہے جس میں وہ یہ اظہار کر رہے ہیں کہ انہیں حروف سے بے ساختہ پیار ہے۔حروف کی سب شکلیں ان کے ہاں دل آویز ہیں۔وہ انکی صورتوں کو استعارات کا پیرہن اس خوبی سے پہناتے ہیں کہ محسوس ہوتا ہے کہ انہیں ان سے عشق ہے۔ان کی سب شکلیں حسنِ فطرت کے کسی نہ کسی زاویے سے نسبت رکھتی ہیں۔مثلاً ان کے نقطے،خطوط کرنوں اور شعاعوں کا عکس ہیں۔ان میں رنگ ہے، روشنی ہے، روپ ہے،زندگی ہے۔یہ عنوانِ حیات ہیں۔یہ سامانِ زیست ہیں جو کسی طرح بھلائے نہیں جا سکتے۔

نہایت قیمتی الفاظ ہیں اپنے خزانے میں
کسی کو کیا خبر خاصیتیں رکھتے ہیں کیا کیا یہ
یہ ہیرے ہیں یہ موتی ہیں یہ نیلم ہیں زمرد ہیں

یہی پکھراج ہیں میرے یہی یاقوت ہیں میرے
یہ اپنے لالہ وگل ہیں یہ شبنم ہیں یہ آنسو ہیں
یہ اپنے چاند تارے ہیں یہ سورج ہیں یہ آتش ہیں
یہ تیکھے تیر ہیں نیزے ہیں خنجر ہیں کلاشن کوف ہیں بم ہیں
یہ آفت ہیں قیامت ہیں کرشمہ ہیں کرامت ہیں
یہ جادو ہیں یہ نغمہ ہیں یہ ہیں اکتارِ زخمہ ہیں
انہیں جب ہم پرولیں گے ہمارے زخم بولیں گے

(''ساری بھول ہماری تھی''۔نظم: ''اظہارِ جلی''۔صفحہ 38)

حضرتِ فاتح کی ترقی پذیر سوچ اب الفتِ حروف سے آگے بڑھتی ہوئی حبِ الفاظ تک آ پہنچی ہے۔انہیں الفاظ کی قدرو قیمت کا بخوبی اندازہ ہے۔بطورِ خاص جو الفاظ ان کے شعری مصرف میں آتے ہیں، کیسے وقیع وثمین ہو جاتے ہیں۔ہم یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ انہوں نے مختلف طبائع کے اعتبار سے الفاظ کی زمرہ بندی کی ہے۔مثلاً بعض لوگ خزائن اور جواہرات سے محبت کرتے ہیں۔ان کی شاہی فطرت کے جواب میں وہ ہیرے، موتی، نیلم، زمرد، پکھراج اور یاقوت کے استعارے اپنے الفاظ کے لیے لائے ہیں۔بعض لوگ مظاہرِ فطرت کے قدردان ہوتے ہیں۔ان کی تسکینِ طبع کے لیے وہ لالہ وگل، شبنم، آنسو، چاند، تارے، سورج اور آتش کے استعارے لائے ہیں۔مہم جو اور جانباز لوگ عمدہ اسلحہ پر جان چھڑکتے ہیں۔ان کی فرحتِ خاطر کے لیے ابو البیان نے تیر، نیزے، خنجر، کلاشنکوف اور بم جیسے حربی استعاروں کا استعمال کیا ہے جبکہ جفا جو اور اذیت پسند لوگوں کے لیے بھی ضیافتِ طبع کا اہتمام فاتح جی نے اپنے خوانِ استعارات میں بڑی خوب صورتی سے کیا ہے۔چنانچہ اس قبیل میں وہ آفت، قیامت اور کرشمہ وکرامت جیسی استعاراتی فضا لائے ہیں۔فنونِ لطیفہ سے دلچسپی رکھنے والے بھی ان کی تفننِ طبع سے محروم نہیں رہے۔لہٰذا ان کے لیے وہ جادو، نغمہ، اکتار اور زخمہ جیسے نادر النظیر استعارات رقم کرتے ہیں۔آخر میں بجا طور پر فرماتے ہیں کہ جب ہم اپنے الفاظ کو کسی غزلیاتی یا نظمیاتی مالا میں پروئیں گے تو یہ بولتے ہوئے محسوس ہوں گے۔گو یا ہم الفاظ میں جان ڈالنے کا ہنر رکھتے ہیں۔

ہمارے جسم جزیرے کا حال مت پوچھو
کٹا پھٹا ہے یہ دن رات کے کٹاؤ سے

ہے اس پہ سلسلہ آتش فشاں پہاڑوں کا
ابلتا رہتا ہے دن رات جن سے لاوا سا
جو چھوڑتا نہیں کچھ بھی وجود میں باقی
ہیں اپنے جسم جزیرے پہ دو بڑی جھیلیں
مگر وہ جھیلیں بھی اب خشک ہونے والی ہیں
ہوائیں چلتی ہیں انفاس کی جو ہولے سے
وہ ناتواں سی ہوائیں بھی رکنے والی ہیں
صدائے بوم کبھی جو سنائی دیتی ہے
وہ صوت بھی نہ سنو تم پہ عین ممکن ہے
جو ملتے رہتے ہیں کچھ قافلے شعاعوں کے
وہ کاروان بھی اب بند ہونے والے ہیں

(''ساری بھول ہماری تھی''۔نظم ''فرسودگی''۔صفحہ:48)

جسم کے لیے جزیرے کا استعارہ اور اس کا کٹاؤ ایک بلیغ اندازِ سخن ہے۔ پھر اس پر مستزاد آتش فشاں پہاڑوں کا سلسلۂ غم واندوہ کی بھرپور عکاسی کرتا ہے۔ یہ دردیلِ شعر اور پرسوز سخن اسی کا شاخسانہ ہے۔ یہی غم ہے کہ وجود میں کچھ بھی باقی نہیں رہا۔ اشک ریز آنکھوں کی دو بڑی جھیلیں آنکھوں کے طور پر نمایاں ہیں۔ لیکن پیہم جھلکتے جھلکتے وہ اب خشک ہونے والی ہیں۔ ساتھ ساتھ سرد آہوں کے جھونکے بھی جاری ہیں تاہم کمزوری کے باعث وہ بھی دھیرے دھیرے چل رہے ہیں۔ یوں لگتا ہے کہ ایک لگاتار ویرانہ ہے جس میں کبھی کبھی الو کی آوازیں سنائی دیتی ہیں۔ سب کچھ مائل بہ فنا ہے۔ ہوسکتا ہے کہ کچھ وقت بعد یہ جھونکے اور یہ صدائیں بھی باقی نہ رہیں۔ قدرت نے اس جزیرے کو اجالنے کے لیے شعاعوں کے جو قافلے چلا دیے ہیں، جنہیں آپ امید کی کرنیں بھی کہہ سکتے ہیں، عین ممکن ہے کہ یہ بھی عنقا ہو جائیں۔ سوائے اصحابِ فکر وخبر ہمارے جسم جزیرے کا حال نہ پوچھو تو بہتر ہے۔ کیونکہ عرضِ حال کی صورت میں بجز غم وحسرت کچھ حاصل نہ ہوگا۔

ایک شاعر کا اپنے نحیف ونزار بدن کے حوالے سے ایسے نادر ونایاب حوالے بہم کرنا یقیناً ایک بہت بڑی استعاراتی کرشمہ کاری ہے۔

ہے ایک غار خطرناک میرے دائیں طرف
کہ جس میں سانپ بھی، بچھو بھی، اژدہے بھی ہیں
ہے خوف ناک بیاباں مرے بائیں طرف
سیاہ پوش فلک کتنا تیرہ باطن ہے
نہ جھلملاتا نظر آئے ایک تارا بھی
فگار ہو کے رہے جس پہ سنگِ خارا بھی
میں گھر گیا ہوں مصائب کے ایسے جنگل میں
جہاں سے بچ کے نکلنا ہزار مشکل ہے

(''ساری بھول ہماری تھی''۔نظم ''ہیں کتنے موت کے سائے مرے تعاقب میں؟''۔صفحہ 87)

نظمِ ھٰذا ایک ایسے خوف کی نظیر ہے جو مسلسل اور تواتر سے رہ نوردِ حیات کو لاحق ہے۔اس خوف کے کئی پہلو ہیں جو دائیں بائیں آگے پیچھے سے انسان کا تعاقب کر رہے ہیں۔ایک طرف ڈر گہرے کھڈ کا استعارہ اوڑھے ہوئے ہے جس میں گرنے کی صورت میں سانپوں، بچھوؤں اور اژدہوں کی زہرناکی کا شکار ہو سکتا ہے۔دوسری طرف پرہول ویرانہ ہے جس میں منتقل ہونے کی صورت میں وہ شیروں، چیتوں اور بھیڑیوں کی خونخواری کا شکار ہو سکتا ہے۔شاعر اوپر کی طرف نگاہ ڈالتا ہے تو شدتِ ظلمات کے باعث آسمان سیاہ پوش اور تیرہ باطن دکھائی دیتا ہے۔اندھیری رات کے لیے آسمان کے حوالے سے دو استعارے کتنے پر اثر ہیں۔اندھیرا ایسا شدید تر ہے کہ ایک ننھا سا ستارہ بھی نظر نہیں آتا۔خوف زدہ بشر نیچے کی طرف دیکھتا ہے تو وہ گل زمیں بھی جسے عرفِ عام میں دھرتی ماتا کہا جاتا ہے، اس قدر اذیت ناک ہے کہ سنگِ خارا کا وجود بھی لہولہان ہو جائے۔ایسے میں زندگی سخن ور کو مصائب کا جنگل محسوس ہو رہی ہے جس سے بچ نکلنا محال ہے۔اس نظم میں استعارات کا ایسا بھرپور تانا بانا عمل میں لایا گیا ہے کہ حیات کی جملہ کٹھنائیاں مصور ہو کر رہ جاتی ہیں۔

پیار حیرت ہے جسے کوئی چھپا بھی نہ سکے
پیار دولت ہے جسے کوئی چرا بھی نہ سکے
پیار آفت ہے جسے کوئی بھلا بھی نہ سکے
پیار نغمہ ہے جسے کوئی گا بھی نہ سکے

پیار نالہ ہے جسے کوئی دبا بھی نہ سکے
پیار شکوہ ہے کہ ہونٹوں پہ جو آ بھی نہ سکے
پیار قصہ ہے جسے کوئی سنا بھی نہ سکے
پیار قرضہ ہے جسے کوئی چکا بھی نہ سکے
پیار فتنہ ہے جسے کوئی سلا بھی نہ سکے
پیار کتنا ہے کوئی اتنا بتا بھی نہ سکے
پیار تمغہ ہے جسے کوئی سجا بھی نہ سکے
پیار وعدہ ہے جسے کوئی نبھا بھی نہ سکے
پیار پردہ ہے کوئی ہٹا بھی نہ سکے
پیار ہے ناز جسے کوئی اٹھا بھی نہ سکے
پیار شعلہ ہے جسے کوئی بجھا بھی نہ سکے
پیار کی آنچ سے دل کوئی بچا بھی نہ سکے
پیار بستی ہے جسے کوئی بسا بھی نہ سکے
پیار طاقت ہے جسے کوئی ہرا بھی نہ سکے
پیار شوخی ہے جسے کوئی رُلا بھی نہ سکے
پیار ٹوٹے تو کوئی اس کو بنا بھی نہ سکے
پیار روٹھے تو کوئی اس کو منا بھی نہ سکے

(''ساری بھول ہماری تھی''۔نظم ''پیار کیا ہے؟''۔صفحہ:79)

استعارات کا ایک موج درموج سلسلہ ہے جزئیات نگاری کی انتہا ہے۔ہم قافیہ وہم ردیف مصرعوں کا نہ تھمنے والا تسلسل ہے۔چھوٹی بحر میں شاعر نے فنکارانہ قیامت ڈھا دی ہے۔ذرا ملاحظہ ہو کہ پیار کی تعریف ایسے جامع انداز میں کس نے کی ہو گی؟ ایک غیر مستور حیات، ناقابلِ سرقہ دولت، ناقابلِ فراموش آفت، ناقابلِ سرود نغمہ، ایسا نالہ جسے دبانا محال ہو، ایسا شکوہ جو لب پر نہ لایا جا سکے، ایسا قصہ جو سنایا نہ جا سکے، ناقابلِ بے باکی قرض، فرو نہ ہونے والا فتنہ، ایسی مقدار جس کے کم و کیف کا اندازہ ناممکن ہو، ناقابلِ نمائش تمغہ، ایک ناقابلِ خوردفریب، ایک نہ ہٹایا جا سکنے والا پردہ، ناقابلِ برداشت ناز، کبھی نہ

بجھ سکنے والی آتش، بے اماں آنچ، نہ بسائی جا سکنے والی بستی، نا قابلِ شکست قوت، ایک ایسی شوخی جو کبھی افسردگی کا شکار نہ ہو، ایک نا قابلِ مرمت چیز اور روٹھ جانے پر منایا نہ جا سکنے والا جذبہ۔ پیار کے اتنے لوازم ایسے استعارات اور ایسی بھرپور ادائیگی کہ جس کا کوئی جواب نہ ہو، جائے استاد خالی است یقیناً ابو البیان ظہور احمد فاتح کا کمالِ سخن اور اعجازِ فن ہی ہو سکتا ہے۔

کنول ہیں نین ترے پھول ہیں لب و عارض
نثار نرگسِ شہلا ہے تیری آنکھوں پر
فدا ہے چنبا چنبیلی تری اداؤں پر
ہے تیرے حسن پہ قربان لالہ و گل بھی
تو گل فراش بھی گل پیرہن بھی لگتا ہے
تو گل بہار ہے میری گلاب سوچوں کا

(''ساری بھول ہماری تھی''۔ نظم ''رشکِ گل''۔ صفحہ 28)

مندرجہ بالا نظم ایک بھرپور شہ پارہ ہے جس میں گل کی تکرار نے اسے مزید پر کشش بنا دیا ہے۔ مزید برآں ایک شاندار استعاراتی سلسلہ نظم ھٰذا میں پایا جاتا ہے۔ ایک ایک مصرع جاذبِ نظر ایک ایک سطر دل آویز و دل نشیں ہے۔ محبوب کی بارگاہِ حسن مآب میں ابو البیان ظہور احمد فاتح نے وہ خراجِ تحسین پیش کیا ہے کہ کائناتِ استعارات میں اس کی نظیر شاذ ہی مل سکے گی۔ الفاظ کی جچی تلی بندش مرکبات کی غیر معمولی جرأت اور شوکتِ الفاظ کی مرصع کاری نظم کو چار چاند لگا دیتے ہیں۔

مشمولہ بالا نظائر کی روشنی میں ہم یہ بات بلا خوفِ تردید کہہ سکتے ہیں کہ حضرت فاتح کے ہاں جہاں دیگر فنی لوازمات بدرجۂ اتم پائے جاتے ہیں، وہاں ان کے ہاں ایک شاندار نظامِ استعارات بھی کارفرما ہے جس سے نظم مرصع کاری کی تصویر بن جاتی ہے۔ پھر ان کے ہاں استعاراتی تنوع اس قدر بسیط ہے کہ قاری ورطۂ حیرت میں ڈوبتا چلا جاتا ہے۔ ان کے ہاں صنعتِ مراۃ النظیر کا ایسا برمحل استعمال اور ایسی منفرد شکلیں پائی جاتی ہیں کہ گماں گزرتا ہے کہ جیسے تجریدی فن کے کسی ماہر نے اپنی موقلم کے کرشمے دکھائے ہیں۔

ابوالبیان ظہور احمد فاتح کی شعری تمثیلات

شاعری ایک جہانِ ہنر ہے۔ یہ دلچسپ فن صنائع وبدائع تشبیہات واستعارات اور شعری تمثیلات سے عبارت ہے۔ ترفعِ خیال اور ندرتِ بیان اس کے تلازمات ہیں۔ شذرہ ھذا میں ہم شاعرِ ہفت زباں ابوالبیان ظہور احمد فاتح کی شعری تمثیلات کے حوالے سے رقم طراز ہیں۔ تمثیلات دراصل بیان کا ڈرامائی اور مثالیاتی انداز ہے جس میں شاعر اپنی تخلیقات کو مثالوں کے پیرائے میں پیش کرتا ہے۔ ذیل میں ہم ان کی ایک نظم کے چند اشعار بطور استشہاد پیش کر رہے ہیں:

یہ جہاں اک رہگزر ہے زندگی ہے اک سفر
حضرتِ انساں ہے رہرو عقل و دل ہیں راہبر
سامنے ہوتے ہیں ہر انسان کے دو راستے
مختلف سمتوں کو جاتے ہیں سدا جو راستے
نام پہلے راستے کا ہے صراطِ مستقیم
گامزن ہوتے ہیں جس پر صاحبِ عقلِ سلیم
عدل و انصاف و اخوت عام ہے اس دین میں
ہے مقرر جرم کی تعزیر اس آئین میں
اس میں شامل ہیں مساوات و مروت کے دروس

ہر طرح سے دلنشیں ہے زندگانی کی عروس
اس طریقِ پرسکوں میں رحمتِ رب عام ہے
نام اس راہِ فلاح الناس کا اسلام ہے

(''آئینۂ دل'' مطبوعہ 1980ء۔نظم''دوراستے''صفحہ 13-14)

بڑے عمدہ تمثیلی انداز میں دینِ فطرت کی خصوصیات کا مذکور ہے جو تمام تر خوبیوں کا مرقع ہے۔جس میں کفر و باطل کی منظر کشی بھی مثالیاتی انداز میں کی گئی ہے اور جن مفاسد کی کیفیات اس میں پائی جاتی ہیں، ان کا حوالہ بھی بھرپور انداز میں دیا گیا ہے۔

ذرا ذیل کی سطور ملاحظہ ہوں:

دوسرا ہے راستہ گمراہی و عدوان کا
اس میں ہو جاتا ہے سرکش ذہن ہر انسان کا
منحنی یہ راستہ ہے پرخطر پرخار ہے
جس میں تاریکی ہی تاریکی ہے یہ وہ غار ہے
عام ہے بے مہری وتخریب و عیاری یہاں
گھات میں ہے رہزنی ومکر و بدکاری یہاں
جبر و استبداد و استحصال اس میں عام ہے
حق پرست و عادل و منصف یہاں ناکام ہے
اس کے رہرو ہیں دغا باز و ذلیل و بد دماغ
لوٹتے ہیں خوب لوگوں کو دکھا کر سبز باغ
راستے واضح ہیں جو چاہو کرو تم اختیار
باعثِ عزت ہے پہلا دوسرا ذلت شعار

(صفحہ:15)

دیکھا آپ نے، کس عمدگی سے دومخالف راستوں یعنی حق و باطل کی منظر کشی تمثیلی پیرائے میں کی گئی ہے۔

آیئے اب ایک اور مجموعہ ءکلام ''سنہرے خواب مت دیکھو'' مطبوعہ 2005 میں سے ایک آزاد نظم

''مراقبیلہ'' میں سے کچھ سطور از راہِ استشہاد پیش کرتے ہیں :

سوال کرتے ہیں ملنے والے
میں کس قبیلے کا آدمی ہوں
مرے قبیلے کی رنگ و نسل و وطن پہ بنیاد ہی نہیں ہے
مرا قبیلہ، قلم قبیلہ
مرا قبیلہ، کرم قبیلہ
مرا قبیلہ، وفا قبیلہ
مرا قبیلہ، رضا قبیلہ
مرا قبیلہ، انا قبیلہ
مرا قبیلہ، گھٹا قبیلہ
مرا قبیلہ، صبا قبیلہ
مرا قبیلہ، دعا قبیلہ
مرا قبیلہ، حنا قبیلہ
مرا قبیلہ، دوا قبیلہ (صفحہ 127-128)

ابوالبیان ظہور احمد فاتح نے عجیب تمثیلی انداز میں پنے قبیلے کے اوصاف بیان کیے ہیں جس سے نظم بہت جاندار بن گئی ہے۔ لطف کی بات یہ ہے کہ ایک آزاد نظم قوافی کے اہتمام کے باعث پابند نظم کا مزہ دے رہی ہے اور لفظ قبیلہ کی تکرار بے حد بھلی معلوم ہو رہی ہے۔ آیئے اب ان کی ایک اور نظم ''ہمارا تن کھوکھلا تنا ہے'' ملاحظہ کرتے ہیں:

مہیب سا تھا وجود اپنا
مگر ہوا جرمِ عشق ہم سے
جلے ہیں فرقت کی آگ میں ہم
بھنک رہا ہے بدن ہمارا
پگھل رہا ہے وجود سارا
بکھرتا جاتا ہے راکھ بن کر

مثالِ ساحل تھا جسم اپنا
جو ہم پہ یلغار کر رہی ہیں
انہی تھپیڑوں میں بہہ گئی ہے بدن کی مٹی
ہمارا تن اک بڑے شجر کے تنے کی صورت
جسے سدا چاٹتی ہے دیمک
اذیتوں کی مصیبتوں کی
ہے جسم اب خالی خول جیسا
کہ جس میں کچھ بھی رہا نہیں ہے

(''سنہرے خواب مت دیکھو''۔ صفحہ 147-148)

کس خوب صورتی سے شاعر اچھے زمانے میں صحت مند بدن کا حوالہ دے کر دورِ فراق نیز اس کی فرسودگی اور علالت کا تذکرہ کرتا ہے اور اسے ایک ساحل سے تشبیہہ دیتا ہے جو مسلسل کٹاؤ سے دوچار رہتا ہے یا پھر ایسے تنے سے مشابہ قرار دیتا ہے جسے آلام و مصائب کی دیمک چاٹ گئی ہو۔ جو باہر سے ٹھیک ٹھاک نظر آرہا ہو مگر اندر سے کھوکھلا ہو چکا ہو۔ زورِ بیان تمثیلات اور جزیات نگاری پورے عروج پر ہے۔

اب اس تمثیلاتی انداز کی ایک اور نظم ''نگاہِ ناز'' پر نگاہ ڈالتے ہیں:

ساقیا! خمار و راحت خیز ہے تیری نگاہ
دلبر و دلدار و دل آویز ہے تیری نگاہ
ایک لمحے میں دلِ مضطر کو دیتی ہے سکون
کتنی پرکیف و محبت ریز ہے تیری نگاہ
آنِ واحد میں گزر جاتی ہے دل کے آر پار
خنجرِ فولاد سے بھی تیز ہے تیری نگاہ
اس کے ہر غمزے پہ قرباں نرگسِ بے باک ہے
کتنی براق و حیات انگیز ہے تیری نگاہ
ہر گھڑی رہتی ہے فاتح کو اسی کی جستجو
کتنی فرحت بخش و لطف آمیز ہے تیری نگاہ

(''تصویرِ کائنات'' صفحہ 87)

ساقی ءِدل نواز سے تخاطب اور اس کی نگاہ کی کرم فرمائیوں کا تذکرہ صرف پانچ اشعار پر مشتمل ایک مختصر سی نظم میں جس جامع انداز میں کیا گیا ہے، اپنی مثال آپ ہے۔ نظمِ ھٰذا خود میں ایک بیکراں تغزل رکھتی ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ تمثیلات کا انبار لگا دیا گیا ہے جو ابوالبیان ظہور احمد فاتح کی ژرف نگاہی اور بالیدہ فکری کا منہ بولتا ثبوت ہے۔ نگاہ کا پر خمار ہونا اور اس کی راحت خیزی ایک وصفِ دل نواز ہے۔ اس کی دلبری، دلداری اور دل آویزی کی کیفیات بلاشبہ دل نشیں ہیں اور پھر اس پر دل کی تکرار کتنی روح افزا ہے۔ چاہے دل کتنا بے قرار کیوں نہ ہو، جونہی چشمِ ساقی کی عنایت اس پر ہوتی ہے، آنِ واحد میں گہرے سکون سے ہم کنار ہو جاتا ہے۔ اس سے دیدہ ءِ محبوب کے پر کیف اور محبت ریز ہونے کی عکاسی ہوتی ہے اور پھر محبت ریز کی ترکیب خود میں کیا کیا نزاکتیں رکھتی ہے، ساقی کی نظر میں اس قدر تیزی ہے کہ مثالِ براق لمحہ ءِ واحد میں دل کے آر پار ہو جاتی ہے۔ اس کی تیزی کا موازنہ شمشیرِ آہن سے بھی کیا گیا ہے جو پلک جھپکنے میں پشتوں کے کشتے لگا دیتی ہے۔ غمزہ ءِ محبوب خود میں یہ شان رکھتا ہے کہ نرگس کی نرگسیت بھی اس پر فدا ہوا چاہتی ہے۔ نگاہِ محبوب بے حد روشن ہے۔ چمک دمک کے علاوہ اس میں حیات انگیزی کی صفت بھی پائی جاتی ہے۔ یعنی اس کی نوازش تنِ مردہ میں روح پھونک دیتی ہے اور زندگی جوبن پر نظر آنے لگتی ہے۔ فاتح کو بھی اس کی جستجو ہمیشہ کیوں نہ رہے کہ اس کی فرحت خیزی یعنی سرور بخشی و لطف آمیزی کی کیفیات حدِ بیان سے باہر ہیں۔

دیکھا آپ نے ایک مجمل سی نگارش خود میں جہانِ تمثیلات لیے ہوئے ہے۔ مرکبِ اضافی، مرکبِ توصیفی، مرکبِ عطفی غرض طرح طرح کے مرکبات تقدیم کر کے لسانی چابکدستی کا بھرپور مظاہرہ کیا گیا ہے۔ پھر ایک مشکل قافیے کو نہایت خوبصورتی سے اور ترکیبی انداز میں بحسن وخوبی نبھایا گیا ہے۔ اسی نوع کی بے شمار منظومات ہیں جو اپنے دلکش فکری و فنی حوالے سے قاری کے لیے آغوش کشا نظر آتی ہیں۔ پھر صرف یہ بات بھی نہیں کہ کوئی نظم ایک طرح کی خوبیوں کا مرقع ہے بلکہ ان میں خصائص کی ایسی ہمہ گیری اور صنائع و بدائع کی ایسی گنگا جمنی فضا پائی جاتی ہے کہ سخن شناس عش عش کر اٹھتا ہے۔ ایک طرف جہانِ تماثیل ہے تو دوسری طرف عالمِ مرکبات ہے۔ الفاظ کی حسین بندش ہے اور تخیلات کی جولانی ہے۔ عربی، فارسی اور ہندی شبدوں کی شاندار آمیزش ہے جو عروسِ اردو کو ایسا پیکرِ جمیل عطا کرتی ہے جسے محسوس کر کے طبیعت باغ و بہار ہو جاتی ہے۔

ابوالبیان ظہور احمد فاتح کا وسیع تر لسانی استخدام

زبان دانی ایک عظیم فن ہے۔ یہ ایک وسیع علم بھی ہے۔کوئی انسان جتنا بڑا ماہرِ لسانیات ہوگا، اس کی تحریر بھی اس قدر لطیف اور پر مغز ہوگی۔ اسی تناظر میں اگر ہم ابوالبیان ظہور احمد فاتح کے کلام کا جائزہ لیں تو پتا چلتا ہے کہ وہ علمِ لغت میں بہت بڑی مہارت رکھتے ہیں۔خصوصاً عربی زبان جسے ام اللسان ہونے کا مقام حاصل ہے، اس میں وہ خاصی دستگاہ رکھتے ہیں۔ اس کا ثبوت ان کا وہ قرآن مجید کا ترجمہ ہے جو انہوں نے ''فاتح الکلام'' کے نام سے کیا ہے۔جس کی طباعت کی تیاری بہت جلد متوقع ہے۔ یہ ترجمہ بلیغ انداز میں کیا گیا ہے۔ساتھ ہی حسبِ ضرورت مختصر تفسیر بھی لکھی گئی ہے۔ وہ اسلامیات کے پروفیسر ہیں۔ ان کا اوڑھنا بچھونا عربی زبان وادب ہے۔ علاوہ ازیں انہیں فارسی زبان میں بھی بڑی دسترس حاصل ہے۔ ان دونوں زبانوں میں انہوں نے شاعری بھی کی ہے۔ عربی مجموعۂ کلام کا نام ''شمیم الوفا'' (غیر مطبوعہ) جبکہ فارسی شعری مجموعے کا نام ''سرودِ رفتہ'' (غیر مطبوعہ) ہے جس میں انہوں نے شیخ فریدالدین عطا اور علامہ محمد اقبال کے فارسی کلام کا منظوم اردو ترجمہ بھی کیا ہے۔ علاوہ ازیں انہوں نے سرائیکی، پنجابی، ہندی اور انگریزی میں بھی طبع آزمائی کی ہے۔ان زبانوں کے شعری مجموعوں کے نام بالترتیب حسبِ ذیل ہیں:

1۔ اساں بہوں دورونجناں ہے (سرائیکی)

2۔ گلاں گوڑیاں (غیر مطبوعہ)

3۔ اب پچھتائے کیا ہوت (غیر مطبوعہ)

4۔ فلاورز آف لیٹرز

لہٰذا ظہور احمد فاتح بجا طور پر شاعرِ ہفت زباں کہلانے کا استحقاق رکھتے ہیں۔ ظاہر ہے ایک اردو زبان ایسی ہی بہت سی زبانوں کا مجموعہ ہے اور ایک ایسا شاعر جو کثیر اللسانی واقفیت و مہارت رکھتا ہے، اس کے لیے اردو سخن مالِ یغما سے زیادہ نہیں ہے۔ بطورِ خاص اردو کلام میں ان کے ہاں جو زورِ تر کیبات پایا جاتا ہے، وہ عربی و فارسی سے گہرے ربط کا ثمرہ ہے۔ اسی لسانی تبحر کے باعث ان کے پاس صنائع و بدائع کی دل نشیں نیرنگی پائی جاتی ہے۔ وہ لکھتے ہیں تو بس لکھتے ہی چلے جاتے ہیں۔ جیسے شاعری کی دیوی کسی کنیزِ خاص کی طرح دست بستہ ان کے حضور حاضر ہو۔ نظامِ تشبیہات و استعارات سے ان کا سخن آراستہ و پیراستہ ہے۔ ان کا قاری کبھی لسانی تنگ دامنی یا قلتِ واقفیت کا شکار نہیں ہوتا بلکہ ہر نیا فن پارہ اس کے آگے حرف و معانی کے نئے آفاق وا کرتا ہے۔ یہ بات محسوس کی گئی ہے کہ ان کے ہاں جس قدر وسعتِ زبان و بیان ہے، اس لسانی تبحر کے علی الرغم ان کے ہاں وسعتِ مضامین کا بھی وہی عالم ہے۔ وہ دینی شاعری یا قومی شاعری کثیر اللسانی سخن ہو یا فنی نادرہ کاری ہو، روحانی فضا ہو یا انقلابی آہنگ، وہ مزاحیہ کلام ہو یا بچوں کی شاعری، غرض ہر شعبۂ سخن میں ان کی کشیدِ جاں موجود ہے۔ انہوں نے نظموں کے ساتھ ساتھ گیت بھی لکھے ہیں۔ منظومات کے سنگ سنگ قطعات نگاری بھی کی ہے۔ قصائد بھی ان کے ہاں پائے جاتے ہیں اور مراثی بھی۔ انہوں نے مناقب بھی رقم کیے ہیں۔ سہرے بھی کہے ہیں۔ ان کے موضوعاتِ سخن میں فلسفہ بھی ہے اور نفسیات بھی ہے۔ منطق بھی ہے۔ نیز سائنس بھی ہے۔ ان کے ہاں معاملہ بندی بھی ہے اور منظر نگاری بھی۔ کوئی پہلو کسی دوسرے پہلو سے کمزور ہونے کی بجائے بڑھتا چڑھتا ہوا ہے۔ ان کی ایک خوبی یہ بھی ہے کہ ہر چیز کو اس کے مخصوص تناظر میں بیان کرتے ہیں۔ جس سے یہ اندازہ بخوبی لگایا جا سکتا ہے کہ وہ علم البیان کے جملہ اسرار و رموز اور تمام تر محاسن سے پوری طرح آگاہی رکھتے ہیں۔

پروفیسر ظہور احمد فاتح نے صرف عربی اور فارسی شاعری کا اردو میں ترجمہ نہیں کیا بلکہ انہوں نے مختلف شعرا کے بلوچی کلام کا بھی منظوم اردو ترجمہ کیا ہے۔ بطورِ خاص بلوچی زبان کے ناخواندہ فلسفی اور دانش ور علی محمد چگھا بزدار کے اکثر و بیشتر کلام کا منظوم اردو ترجمہ انہوں نے اپنی کتاب ''عکاسِ فطرت'' مطبوعہ 1991ء میں کیا ہے جس کا محرک ان کے بلوچ شاگردِ بزرگ غلام قادر خان بزدار رہے جو بذاتِ خود

شاعر بھی ہیں۔ اسی طرح پروفیسر ظہور احمد فاتح نے دیگر بلوچ شعرا مثلاً مست توکلی، جواں سال بگٹی، جام ڈرک، دیورگ رند، رحمان چاکرانی بزدار، پلیہ کھوسہ، سکندر کھوسہ، حیدر خان لاوانی اور حسین ولد جمال خان (واضح رہے کہ بلوچی زبان میں خان کو حان لکھتے ہیں) وغیرہ کے مختلف بلوچی اصنافِ سخن کا منظوم اردو ترجمہ شعری مجموعہ ''ہفت رنگ'' میں کیا ہے جسے بلوچی ادب کی اردو شعروادب سے تال میل کا بہترین ذریعہ قرار دیا گیا ہے اور طرفین کے ادبی حلقوں میں استحسان وتحیر سے لیا گیا ہے۔ حیرت کی ایک وجہ یہ بھی رہی ہے کہ یہ کام بلوچی زبان کے کسی شاعروادیب کے کرنے کا تھا جسے جنابِ فاتح نے بصد حسن وخوبی سرانجام دیا ہے۔ اسی پر بس نہیں بلکہ انہوں نے اردو کے معروف شاعر ظریف احسن مقیم کراچی کی خواہش کے عین مطابق ان کے اردو مجموعہ کلام ''موسم موسم ملتے تھے'' کا منظوم سرائیکی ترجمہ بھی کیا جو شائع ہو چکا ہے جس کی اردو اور سرائیکی دونوں زبانوں کے اصحابِ ادب نے خوب تعریف وتوصیف کی ہے۔

جب بڑے بڑے مضامین سامنے ہوں اور عظیم سائل دعوتِ فکر وعمل دے رہے ہوں، عموماً چھوٹی چھوٹی چیزیں نظر انداز ہو جاتی ہیں۔ لیکن ابوالبیان ظہور احمد فاتح کے ہاں ایسی کسی ناانصافی کا کوئی تصور نہیں ہے۔ وہ ہر شعبے کو اس کا حق دینا لازمی سمجھتے ہیں۔ لہٰذا لوری جیسی صنف جس پر شاذ ونادر ہی قلم اٹھایا گیا ہے، اس پر بھی طبع آزمائی کرنا انہوں نے لازمی جانا ہے اور ایک ایسی لوری تخلیق کی ہے جسے اپنی جزئیات کے اعتبار سے ایک مکمل نگارش قرار دیا جا سکتا ہے۔ لوری کے تقاضوں میں یہ امور شامل ہیں کہ بچے کو دل نشیں انداز میں نیند کی طرف راغب کیا جائے، پھر اسے سکون کی نیند سلایا جائے اور اس کے حق میں شفقت آمیز دعائیں کی جائیں۔ اس کے لفظ لفظ میں محبت اور ممتا جھلک رہی ہو۔ اس کے الفاظ سادہ ہوں جو بچے کو آسانی سے سمجھ آ جائیں اور اس پر لطف وملائمت کا عنصر غالب ہو۔ ان مقاصد کو مدنظر رکھتے ہوئے اگر ہم زیرِ نظر لوری کا جائزہ لیں تو یہ ان تمام معیارات پر پوری اترتی ہے۔

سو جا ماں کے دل کے ٹکڑے باپ کی آنکھ کے تارے
سو جا سو جا خیر خوشی سے میرے راج دلارے
سن کے میٹھی میٹھی لوری سو جا میرے پیارے
سو جا جلدی چاند کے ٹکڑے امی صدقے جائے
سو جا میرے لعل سدا تو اچھی صحت کو پائے

دیکھ کھڑی ہے نیند پری کس وقت سے ہاتھ پسارے
سو جا دنیا کی ہر فرحت تیرا دل بہلائے
سو جا خوابوں کی شہزادی تیری لوری گائے
سو جا چاند کی دادی اماں تیرے بال سنوارے
سو جا بیٹے اللہ تیرے نیک نصیب بنائے
اچھے اچھے کپڑے پہنے اچھا اچھا کھائے
سو جا تیرے پاؤں چومیں سورج چاند ستارے
سو جا تو دنیا میں دولت، عزت، عظمت پائے
نیکی سیکھے، علم کمائے، کام جہاں کے آئے
مردِ مجاہد بن کے اپنی قوم کا حال سدھارے
سو جا خیر خوشی سے میرے راج دلارے

(''آئینۂ دل'' ـنظم: لوری صفحہ 62-63)

یہ نظم ایک مثالی لوری کہی جا سکتی ہے۔ ہر شعر میں سو جا کی تکرار بچے کے لیے بھرپور میٹھی نیند کا درجہ رکھتی ہے۔ پھر ہر شعر میں محبت اور اپنائیت کا ایک احساس جاگزیں ہے۔ نفیس جذبات کا اظہار ہے۔ تقدیم دعا کے بہترین کوائف ہیں۔ مامتا کی دل نواز فضا ہے۔ غرض وہ سب عوامل جو لوری کے لیے جاگزیر ہوتے ہیں، پورے طور پر جلوہ پیرا ہیں۔ یقیناً یہ ابوالبیان ظہور احمد فاتح کا خاصا ہے کہ وہ موضوع سے پورا پورا انصاف کرتے ہیں۔ ان کی اس لوری کو ادبِ نسواں اور ادبِ اطفال میں ایک نمایاں مقام حاصل رہے گا۔ یہی علامات ہیں ادبیات کے وسیع تر لسانی استخدام کی جس میں کوئی گنجائش کہیں باقی نہ رہے۔

ادبیاتِ عالیہ میں ایک اور صنف واسوخت ہے۔ جس طرح قدیم دور میں اہلِ سخن شہرِ آشوب اور قصائد لکھا کرتے تھے، اسی طرح واسوخت بھی ایک خاص قسم کی نظم ہوتی ہے جس میں محبوب کے جور و جفا اور محب کے مہر و رضا کے حوالے سے بات ہوتی تھی لیکن رفتہ رفتہ اس کا رواج جاتا رہا۔ تاہم ابوالبیان ظہور احمد فاتح جو روایات سے محبت کرنے والے شاعر ہیں، وہ ایسی نگارشات بھی ضرور تخلیق کرتے ہیں جو متقدمین کے ہاں کبھی کبھی مروف رہی ہوں۔ ان کی زیرِ نظر واسوخت بھی ایک خصوصیات کی مالک ہے بلکہ اسے جدت سے ہم کنار کیا گیا ہے تا کہ عصری مقتضیات پوری کی جا سکیں۔ واسوخت ھٰذا میں فردا کے

تلامذہء ادب کے لیے ایک نمونہ پایا جاتا ہے جسے ہم کاوشِ احیا بھی قرار دے سکتے ہیں تاکہ ایک دلچسپ صنف وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ مفقود نہ ہو جائے۔

ہے تیرا پیکر مری نظروں میں جاذب آج بھی
عشق تیرا ہے جہانِ دل میں واجب آج بھی
تو سمجھتا ہے کمی آئی ہے میرے پیار میں
دل کھنچا جاتا ہے پیارے تیری جانب آج بھی
داغ جو بخشے ہیں تو نے کج ادائی سے مجھے
ان کی گرمی سے شہابِ دل ہے ثاقب آج بھی
آج بھی چھائی ہوئی ہے دل پہ تیرے غم کی رات
اے کہ تو ہے حرمنِ راحت کا غاصب آج بھی
صبر و خاموشی سے سہتا ہوں ترے جور و جفا
میں سمجھتا ہوں شکایت نامناسب آج بھی
آج بھی موجود ہے تجھ میں وہی خوئے ستم
تو نظر آتا ہے دکھ دینے پہ راغب آج بھی
طاقِ نسیاں پہ سجا رکھا ہے اب تو نے مجھے
دل ہے تجھ سے اس وفاداری کا طالب آج بھی
کل بھی میرے دل کے چاروں سمت تھی غم کی فصیل
کم نہیں ہیں میرے سر پر کچھ مصائب آج بھی
چل بسا ہے ان کے دل سے جذبہء مہر و خلوص
شہر میں آباد ہیں ورنہ اقارب آج بھی
کیا ہوا گر گردشِ دوراں نے مفلس کر دیا
اصل میں تو ہم وہی ہیں خان صاحب آج بھی
حالیؔ و اقبالؔ ہیں فاتحؔ ہمارے معترف
ہے ہمی سے تازہ یادِ میرؔ و غالبؔ آج بھی

پروفیسر ظہور احمد فاتح اس واسوخت میں محبوبِ دل نواز سے مخاطب ہوکر کہہ رہے ہیں کہ تیرا حسن و جمال آج بھی ہماری نگاہ میں وقیع ہے۔ اگرچہ دورِ گزراں اور امتدادِ زمانہ ہر ذی روح وغیر ذی روح پر اثر انداز ہورہا ہے مگر ہم نے اپنا معیارِ حسن و جمال تبدیل نہیں کیا۔ ہم آج بھی تیرے قدردان ہیں اور تیری محبت امروز بھی اپنے لیے ناگزیر سمجھتے ہیں۔ اگرچہ تونے سردمہری کا ثبوت دیتے ہوئے ہمارے من پر گھاؤ لگائے ہیں لیکن ہم ان زخموں کو پھول اور ان داغوں کو شہابِ ثاقب خیال کرتے ہیں جو تونے عطا کیے ہیں۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ ہم نے دیارِ دل سے تیرے غم کو بے دخل نہیں ہونے دیا اگرچہ تو ہمارا چین چراتا رہتا ہے۔ پھر بھی ہم اسے تیرا حق سمجھتے ہیں۔ جو ستم بھی تو ڈھاتا رہتا ہے، اسے نہایت صبر و شکیب سے گوارا کرلیتا ہوں۔ حق تو یہ ہے کہ زباں پر حرفِ شکایت بھی نہیں لاتا۔ جہاں ہمارے استقلال کا یہ عالم ہے، وہاں تیری ثابت قدمی میں بھی کوئی فرق نہیں آیا۔ نہ تونے طرزِ جفا چھوڑی ہے اور نہ ہم نے اندازِ وفا ترک کیا ہے۔ مرے محبوب تونے جس شخص کو بھلا چھوڑا ہے، وہ آج بھی تیری یاد میں مست و مگن ہے۔ البتہ دل یہ مطالبہ ضرور کرتا ہے کہ کاش تو بھی پابندِ وفا ہوجائے۔ جس طرح ہم پہلے محبت میں دکھ جھیلا کرتے تھے، وہ روش آج بھی برقرار ہے۔ آج بھی ہمارا دل غمِ جاناں کے محاصرے میں ہے۔ آج درد و سوز کی یورشیں اس پر جاری و ساری ہیں۔ یہ بے رخی اور بے اعتنائی صرف شیوۂ محبوب نہیں بلکہ عصری بے حسی کا یہ منظر نامہ ہر طرف مشاہدہ کیا جاسکتا ہے۔ یہاں تک کہ اعزا و اقربا بھی اس کیفیتِ دار و گیر میں شامل ہیں۔ اپنا تو یہ حال ہے کہ مرورِ ایام نے کمزور کردیا ہے تاہم دل پہلے کی طرح رعنا اور جذبات پہلے کی طرح جوان ہیں۔ یہاں تک کہ ہماری بود و باش ویسی کی ویسی ہے۔ ہمارے سخن میں بھی وہی توانائی اور اثر انگیزی پائی جاتی ہے جو اساتذۂ سخن کا شیوہ رہی ہے۔ جہاں حالی و اقبال ہماری قومی شاعری کا اعتراف کرتے ہیں وہاں ہمارے رومانوی سخن سے میر و غالب کی یادیں تازہ ہیں۔

نظمِ ھٰذا خود میں عجیب احتمالات رکھتی ہے۔ اپنی محبت کی پائیداری ہی پائیداری، محبوب کی ستم ایجادی، دل کی شہاب آمیزی، جذبات کا تموج، خیالات کا تلاطم، تصورات کی رعنائی، زمانی کیفیات کا تقابل، مکانی آفات کی یورشیں اور ان سب کے باوجود شاعر کا عرفانِ ذات اور تعلیاتِ سامانی ایک عجیب نیرنگِ خیال پیدا کررہی ہے جیسا کہ خود ایک موقع پر لکھتے ہیں۔

میں نے اک رنگ میں سو رنگ بھرے ہیں فاتح
ایک نیرنگ لیے ہے میرے انکار کا رنگ

اگرفنی لحاظ سے نظمِ ھذا کا جائزہ لیا جائے تو اس میں بڑی زرخیزی اور شادابی پائی جاتی ہے۔ تراکیبِ نو بہ نو،تشبیہات واستعارات کا استخدام اور تلمیحات کا التزام ایک گنگا جمنی ماحول پیدا کررہا ہے۔ شعرا کی ایک خصوصیت حال نگاری ہے جس میں اس کے بارے میں جتنا زیادہ استعداد پائی جاتی ہے اسے اتنا زیادہ باکمال سخن ور سمجھا جاتا ہے۔اس حوالے سے ابوالبیان ظہور احمد فاتح بھی کسی سے پیچھے نہیں رہے بلکہ انصاف کی بات تو یہ ہے کہ چار قدم آگے دکھائی دیتے ہیں۔زیرِ نظر نظم ''آہٹ'' جو ان کی کتاب ''چہرۂ ہستی''،مطبوعہ دسمبر 2014ء میں شامل ہے،ان کی اس صلاحیت کا مظہر ہے کہ کیسے وہ ایک ادنیٰ سی بات کو وسیع تر پیمانے میں زیرِ بحث لا سکتے ہیں۔ان کا یہ لسانی استخدام اپنی مثال آپ ہے۔ ذرا آپ بھی ہمارے ساتھ محظوظ ہوں۔

مرے کانوں کے پردے گدگداتی ہے کوئی آہٹ
دلِ حساس کی گھنٹی بجاتی ہے کوئی آہٹ
خدا جانے کیا کوئی واہمہ ہے یا حقیقت ہے
کہ مجھ کو رات بھر آ کر جگاتی ہے کوئی آہٹ
نظر آتا نہیں حدِ نظر تک گامزن کوئی
نجانے کیوں مجھے پیہم ستاتی ہے کوئی آہٹ
مجھے لگتا ہے کوئی چھپ رہا ہے میرے پہلو میں
مرے کانوں میں آہستہ سی آتی ہے کوئی آہٹ
ہوا جاتا تھا دل مایوس کچھ کچھ ان کی آمد سے
مگر تھوڑی سی اب ڈھارس بندھاتی ہے کوئی آہٹ

(صفحہ:89)

ایک آہٹ جو واہمی بھی ہوسکتی ہے اور حقیقت بھی،جس کا تعلق پائے جاناں سے بھی ہوسکتا ہے اور ہوا کی شوخی سے بھی،اس سے قلبِ شاعر کس کس طرح متاثر ہوتا ہے،نظمِ ھذا اس کی جیتی جاگتی تصویر ہے۔وہ لکھتے ہیں کہ کوئی ایسی آہٹ ہے جو پردۂ گوش میں سرسراہٹ پیدا کررہی ہے۔ جو دلِ حساس کی جرس بجارہی ہے۔ یہ وہ آہٹ ہے جس کی وجہ سے پل پل شاعر کی آنکھ کھل جاتی ہے۔اس کی نیند کا تسلسل مجروح ہوتا ہے۔ اگرچہ بظاہر کوئی دکھائی نہیں دیتا مگر ایسا لگتا ہے کوئی آ رہا ہے۔ یوں لگتا ہے جیسے کوئی

قریب ہی چھپا ہوا ہے مگر نظر نہیں آ رہا تاہم اس کی آہٹ دھیرے دھیرے سماعت میں تیر رہی ہے۔ پہلے تو کچھ عالمِ یاس طاری ہو چلا تھا کہ آنے والے کے آنے کا کوئی امکان نہیں پھر یہ آہٹ جو سنائی دی ہے، کسی کی آمد کی امید بندھ چلی ہے۔

یہ نظم گوناگوں کیفیتیں اپنے دامن میں لیے ہوئے ہے۔ کبھی لطف و راحت کی کیفیت کبھی بیم و یاس کا اثر، کبھی حقیقت کی ترجمانی، کبھی خیالِ واہمہ، کبھی ایک موہوم سی اذیت، کبھی ایک نشاط آمیز تاثر، کبھی از سرِ نو بندھتی ہوئی امید، کبھی تخیل کی بلند پروازی اور کبھی انشائیہ کی ہمہ گیری۔ غرض تمام ایسے امکانات جن کا لسانی استخدام سے گہرا تعلق بنتا ہے۔

شاعر جسے تلمیذ الرحمان یعنی شاگردِ خدا بھی کہا جاتا ہے، الفاظ کا شعبدہ گر ہوتا ہے۔ بحور، قوافی و ردیف کا انتخاب، اس کے تنقیدی شعور کا مرہونِ منت ہوتا ہے۔ الفاظ کا چناؤ وہ حسبِ منشا کرتا ہے۔ چنانچہ وہ ذاتی لیاقت اور قدرتِ کلام کا مظاہرہ کرتے ہوئے ایک ایسا فن پارہ پیش کرتا ہے جسے پڑھ کر عقل دنگ رہ جاتی ہے۔ ابوالبیان ظہور احمد فاتح کو بھی اپنے ہنر پر مکمل دستگاہ حاصل ہے۔ لسانیات کی مہارت نے انہیں ایسی رسائی بخشی ہے کہ الفاظ و مرکبات ان کی سرشتِ شعر میں آ کر خود بخود مرصع کاری کرتے چلے جاتے ہیں اور روح پرور شعری پیکر وجود میں آتے چلے جاتے ہیں جو ان کی ندرتِ بیان کا منہ بولتا ثبوت بن جاتے ہیں۔ یہاں ہمارے روبرو ان کی ایک نظم ''حسنِ طلب'' ہے جو بحر متقارب مثمن سالم میں ہے اور غزل کی ہیئت میں لکھی گئی ہے۔ اس نظم کے قوافی اکثر و بیشتر دل نشیں استعارات پر مبنی ہیں۔ نظم ھٰذا میں ایک اور خوبی یہ ہے کہ اس میں تغزل کی چاشنی پائی جاتی ہے۔ نظم ملاحظہ ہو:

یہ آنکھیں بلوریں یہ چہرہ کتابی
یہ لب پتلے پتلے گلابی گلابی
یہ بل کھاتی زلفیں یہ افشاں شہابی
یہ ڈھلکا ہوا تیرا آنچل سحابی
بپا حشر کرتی ہیں دنیائے دل پر
یہ چالیں غزالی یہ گھاتیں عقابی
ستم ہے غضب ہے یہ پردہ نشینی
ہے عیدِ نظارہ تری بے حجابی

پلائی ہے جب سے نگاہوں سے تو نے
زمانہ سمجھتا ہے مجھ کو شرابی
سمجھتا ہوں تیری مقدس نشانی
یہ بے تابیٔ دل یہ خانہ خرابی
یہی ایک خواہش مچلتی ہے دل میں
عطا ہو سدا عزتِ باریابی

(صفحہ 96-97)

استعارات کا تموج عجیب کیفیت پیدا کر رہا ہے۔آنکھیں بلوریں، چہرہ کتابی، ہونٹ گلابی، افشاں شہابی، آنچل سحابی، چالیں غزالی، گھاتیں عقابی، عیدِ نظارہ، بیتابیٔ دل اور خانہ خرابی کیسی کیسی مقدس نشانیاں ہیں۔آپ خود اندازہ لگا سکتے ہیں۔علاوہ ازیں لب پتلے پتلے، بل کھاتی زلفیں، ڈھلکا ہوا آنچل، پردہ نشینی، نگاہوں کا پلانا، زمانے کا شرابی سمجھنا، دل میں خواہش کا مچلنا اور عزتِ باریابی، کیا کیا خوبصورت بندشیں ہیں جو ایک دل کش سماں باندھے ہوئے ہیں۔عربی، فارسی زبانوں کے الفاظ ہیں جو مرکبات میں ڈھلتے اور بیل بوٹے بناتے جا رہے ہیں۔درمیان میں ہندی زبان کی نمکینی بھی ذائقے کو نکھار رہی ہے۔ایسا لگتا ہے کہ ہفت رنگ افشاں ہے۔مختلف زبانیں ہی جو مل کر قوسِ قزح کا رنگ ڈھا رہی ہیں۔چست بندش ہے جو جا بجا اپنی بہار دکھا رہی ہے۔تخیل رفعتِ پرواز پر لگتا ہے۔تصور نے پیراہنِ رنگیں زیب تن کر رکھا ہے اور وسیع تر لسانی استخدام اپنے پورے جوبن پر دکھائی دے رہا ہے۔استادانہ مہارت، کرشمہ سازی، ریاضت اور ندرتِ بیان نے قلم توڑ کر رکھ دیا ہے۔

ابوالبیان ظہور احمد فاتح کی نظم اور ہیئتی تجربات

علامہ اقبال نے فرمایا تھا:

ہے مردِ سخن ساز بھی دنیا میں عجب چیز
پاؤ گے کسی فن میں کہیں تم نے اسے بند

ان کا یہ شعر ابوالبیان ظہور احمد فاتح پر صادق آتا نظر آتا ہے کیونکہ انہوں نے عالمِ فن میں ایسے ایسے وسیع تجربات کیے ہیں جو اپنی مثال اپ ہیں۔ انہوں نے ایسی نادرہ کاریاں دکھائی ہیں کہ عقل دنگ رہ جاتی ہے۔ نظم، غزل، گیت، سہرے، قصائد، مراثی، قطعات، ماہیے اور ابیات اس کثرت سے لکھے ہیں کہ ذہن عش عش کر اٹھتا ہے۔ پھر خود نظمیات میں بھی انہی ہیئتی تجربات کو دہرایا ہے۔ زیادہ تر شاعری جیسے غزل میں کی ہے، اسی طرح نظمیں بھی غزل کی ہیئت میں لکھی ہیں۔ جن میں غزل کی چاشنی، نظم کا تسلسل، وسعتِ فکر، ترفعِ خیال، تنوع اور بوقلمونی کی کیفیات بدرجہءِ کمال موجود ہیں۔ اسی طرح مثنوی کے انداز میں بھی بہت سی نظمیں رقم کی ہیں۔ ایسا لگتا ہے کہ دوسرے نمبر پر مثنوی کے رنگ کی نظمیں ہیں۔ دراصل مثنوی عرصہءِ دراز سے اردو ادب کی روایت کا حصہ رہی ہے جس میں قصص اور داستانیں مرقوم کی جاتی تھیں۔ انہوں نے اسی ہیئتی روایت کو خوب آگے بڑھایا ہے۔ نظم کی ایک اور صورت ثلاثی ہے۔ اسے بھی اپنی نظم میں انہوں برتا ہے اور خوب جوہرِ فن دکھائے ہیں۔ علاوہ ازیں قطعہ بند کو بھی انہوں نے ذریعہءِ نظم بنایا ہے جو خاصا موثر ثابت ہوا ہے۔ مزید برآں مخمس، مسدس، ترجیع بند، نظمِ معریٰ اور آزاد نظم کے تجربات بھی بہ حسن وخوبی کیے ہیں۔ ان کے یہ فنی تجربات تلامذہءِ ادب کے لیے روشن مثال کا درجہ رکھتے ہیں۔

ذیل میں ہم ان اصناف کے کچھ نمونے بطور مثال پیش کرتے ہیں تا کہ قارئیں کرام ان کے تبحرِ ہنر کا اندازہ لگا سکیں۔

سب سے پہلے دو نظمیں غزل کی ہیئت میں لکھی گئی ہدیہءِ قارئین ہیں:

1۔شاعر کی دعا:

خدایا عطا کر کچھ ایسے ذرائع
کہ ہو جائے میرا یہ دیوان شائع
مرے شعر کو بخش دے یا الٰہی
لطافت، نزاکت، صنائع بدائع
کچھ ایسی حرارت ہو میرے سخن میں
کہ ہوں اس کی گرمی سے پتھر بھی مائع
دلوں پر موثر ہوں اشعار میرے
سکوں ان سے حاصل کریں سب طبائع
مری مشعلِ فن سے روشن جہاں ہو
دعا ہے مری کاوشیں ہوں نہ ضائع

(''آئینہءِ دل''۔صفحہ 12)

نظم ھٰذا میں تین باتیں خاص ہیں۔ایک تو یہ غیر مردف ہے، دوسری یہ کہ قافیہ نادر ہے اور تیسری یہ کہ ایک شاعرِ نادار کی معصومانہ آرزو غزل کے روپ میں منظوم کی گئی ہے۔

2۔پیش گوئی:

اقتدارِ ظلم کی ہوگی تباہی ایک دن
ہو گی آئینِ خدا کی بادشاہی ایک دن
عام ہو گی نورِ حق کی ضوفشانی ہر طرف
دور ہو گی روئے ہستی کی سیاہی ایک دن
ختم ہو گا ظلم و افلاس و جہالت کا فسوں
ہو گا جنت یہ جہانِ مرغ و ماہی ایک دن
جس کے باعث قلب میں رہتا نہیں خوفِ خدا

خاک میں مل جائے گی وہ کج کلاہی ایک دن

آخرت کو آدمی سمجھے گا دنیائے عزیز
ٹوٹ جائے گا طلسمِ کم نگاہی ایک دن

عالمِ درماندگی میں آج بھی ہے جو رواں
پہنچ جائے گا سرِ منزل وہ راہی ایک دن

دیکھنا یہ امتیازِ رنگ و خوں مٹ جائے گا
ہو گا ہر دل میں مذاقِ خیر خواہی ایک دن

یہ جہاں بن جائے گا گہوارۂ امن و سکوں
پوری ہو گی قلبِ شامہ کی گواہی ایک دن

(''چہرۂ ہستی''۔صفحہ 58-59)

اس نظم کے خواص یہ ہیں کہ یہ مردف غزل کی ہیئت میں قلم بند کی گئی ہے۔مشکل قافیہ اور دولفظی ردیف ہے۔نظم خود میں ایک شان وشوکت اور انقلابی آہنگ رکھتی ہے۔

اب ہم دوایسی منظومات نقل کرر ہے ہیں جو مثنوی کی ہیئت میں لکھی گئی ہیں۔

1۔اٹوٹ ناتا:

جب تک جیون رنگ رہے گا
تیرا میرا سنگ رہے گا
میں دل ہوں اور تو دھڑکن ہے
میں ہوں کلائی تو کنگن ہے
میں انگوٹھی تو موتی ہے
میں بادل ہوں تو بجلی ہے
میں آکاش ہوں تو سورج ہے
میں محفل ہوں تو سج دھج ہے
میں ساگر ہوں تو ساحل ہے
میں تارا ہوں تو جھلمل ہے
میں گلشن ہوں تو خوشبو ہے

میں صحرا ہوں تو آہو ہے
میں ہوں آنکھ بصارت تو ہے
میں ہوں کان سماعت تو ہے
میں ہوں رات، سویرا تو ہے
میں ہوں تیرا، میرا تو ہے
لازم اور ملزوم ہیں دونوں
خادم اور مخدوم ہیں دونوں
جب تک جیون رنگ رہے گا
تیرا میرا سنگ رہے گا

(''کچھ دیر پہلے وصل سے''۔صفحہ 157-158)

مثنوی کی ہیئت میں مرقوم چھوٹی بحر والی نظم ہے جو بحرِ میر یا بحرِ متدارک مثمن مخبون میں لکھی گئی ہے۔ ہندی ذائقہ خود میں لیے ہوئے ہے۔مخزنِ استعارات ہے۔بحرِ جذبات ہے۔حسنِ محسوسات ہے۔سراپا نفسیات ہے۔

2۔خدا سے باتیں:

میں نہ مشرک کہ بنا کر تیری پوجوں مورت
نہ میں ناداں کہ چاہوں گا مجازی صورت
میں نہ ہندو کہ کسی کو کہوں اوتار ترا
نہ میں کافر ہوں کہ کرتا پھروں انکار ترا
میں نہ عیسائی ، کروں تین میں تقسیم تجھے
نہ میں یونانی کہ صدہا کروں تسلیم تجھے
میں نہ اولاد کسی کو تیری گردانوں گا
نہ ترا روپ بدلنے کو بجا جانوں گا
میں نہ راہب ہوں کہ صحراؤں میں پاؤں تجھ کو
نہ میں صوفی ہوں کہ حجرے میں بلاؤں تجھ کو

(''چہرہ ءہستی''۔صفحہ 11)

سادہ وسلیس مثنوی کا دینی رنگ، حمد نگاری کا ایک نیا اسلوب اور ابلاغیت کا عمدہ نمونہ ہے۔ ایک ادرا کی تموج ہے جو کارفرما ہے۔

اس کے بعد مثلث یا ثلاثی کا نمبر آتا ہے۔ اس سلسلے میں بھی بطور نمونہ دو نظمیں پیش کی جا رہی ہیں۔

1۔ صورتیں یہ حروفِ ابجد کی:

صورتیں یہ حروفِ ابجد کی
آڑی ترچھی سی مختلف شکلیں
کتنی دلکش ہیں میری نظروں میں
میں کسی کو بتا نہیں سکتا

صورتیں یہ حروفِ ا بجد کی
خط ،کشش ، نیم دائرے ، قوسیں
یہ شعاعیں یہ نور کی کرنیں
ان سے نظریں ہٹا نہیں سکتا

صورتیں یہ حروفِ ابجد کی
جن کے خم خم ہیں زلفِ جاناں کے
جن کے نقطے ہیں خال خوباں کے
ان سے میں دور جا نہیں سکتا

صورتیں یہ حروفِ ا بجد کی
جاں فزا ، دل نشیں، نظر پرور
ہیں نگاہیں جمی ہوئی ان پر
ان سے آنکھیں چرا نہیں سکتا

صورتیں یہ حروفِ ابجد کی
رنگ ان سے ہے روشنی ان سے
روپ ان سے ہے زندگی ان سے
ان کی چاہت چھپا نہیں سکتا

صورتیں یہ حروفِ ابجد کی

جو ہیں عنوان میری ہستی کا
جو ہیں سامان میری مستی کا
ان کو فاتح بھلا نہیں سکتا

(''ساری بھول ہماری تھی''۔صفحہ 26-27)

مختصر بحر، بحرِ خفیف مسدس محذوف۔شاعر جو حرف کی حرمت کا نمائندہ ہوتا ہے، حروف سے کتنی محبت کرتا ہے،اس کا مظہر یہ نظم ہے۔

2۔اے جانے والو!تمہیں الوداع کیسے کہوں؟

بہت حزیں ہے تصور تمہارے جانے کا
یہ سوگوار سا اک موڑ ہے فسانے کا
کہ جیسے لوٹ کے جائے کوئی نقدِ سکوں
اے جانے والو! تمہیں الوداع کیسے کہوں؟
جو وقت ساتھ گزارا کبھی نہ بھولے گا
ہمیں خلوص تمہارا کبھی نہ بھولے گا
نہ ہو گا محو کبھی یہ رفاقتوں کا فسوں
اے جانے والو! تمہیں الوداع کیسے کہوں؟
دعا کا ہوش نہیں ، معذرت کی تاب نہیں
کتابِ زیست کا یہ آخری تو باب نہیں
کہ اشک بار ہیں آنکھیں تو دل ہے زار و زبوں
اے جانے والو! تمہیں الوداع کیسے کہوں؟
یہ شوخ و شنگ سے چہرے، یہ دل نشیں چہرے
نہ ہو سکیں گے فراموش یہ حسیں چہرے
جنوں مصر ہے کہ میں بھی تمہارے ساتھ چلوں
اے جانے والو ! تمہیں الوداع کیسے کہوں؟

(''ساری بھول ہماری تھی''۔صفحہ 124)

استفہامیہ انداز اور اشارات سے مزین سہ مصرعی نظم ہے جو متوسط بحر پر مشتمل ہے۔وفورِ جذبات

دیدنی ہے۔الوداعی لمحات کا رقت آمیز منظر ہے جو رومانویت اور سوگواری سے لبریز ہے۔

ثلاثی کی محولہ بالا دونوں نظمیں ہیئتی اعتبار سے اختصاصی رنگ رکھتی ہیں کیونکہ عموماً مثلث نظمیں تین ہم قافیہ مصرعوں پر مشتمل ہوتی ہیں لیکن یہاں ٹیپ کے مصرعے کے مطابق تیسرا مصرع لگتا ہے جس سے نظموں میں انفرادیت وخوب صورتی میں اور اضافہ ہوجاتا ہے۔

بعدازاں قطعہ بند نظموں کا نمبر آتا ہے۔لہٰذا اس سلسلے میں بھی دو نظمیں نذرِ قارئین ہیں:

1۔ایک انجام رسیدہ ظالم کے نام:

تو نے سوچا تھا کہ ظلمت کو بقا حاصل ہے
تو نے سیہ رات کو محرومِ سحر سمجھا تھا
تو نے سوچا تھا کہ ہے ظلم کا مٹنا مشکل
کتنا نادان تھا تو خود کو امر سمجھا تھا

تو نے سوچا تھا کہ حق چھین کے انسانوں کے
نشۂ عیش میں مخمور رہوں گا ہر دم
لوٹ کے اہلِ زمانہ سے مسرت ان کی
تو نے سوچا تھا کہ مسرور رہوں گا ہر دم

تو نے سوچا تھا یونہی قتل کیے جاؤں گا
دہر میں جو کوئی خود دار نظر آئے گا
تو نے سوچا تھا کہ چیخوں کا اثر نہ ہوگا
تو نے سمجھا تھا لہو رنگ نہیں لائے گا

تو نے قدرت کے اصولوں کا اڑایا تھا مذاق
تو نے یہ سمجھا تھا کہ ہے تیرے ہی بس میں سب کچھ
تو نے یوں قدرتِ یزداں کو بھلا چھوڑا تھا
تو یہ سمجھا تھا کہ ہے دستِ ہوس میں سب کچھ

تو نے سوچا تھا کوئی روکنے والا ہی نہیں
دہر میں یونہی سدا ظلم کیے جاؤں گا
تو نے محفوظ سمجھ رکھا تھا خود کو ناداں
تو نے سوچا تھا کہ میں یونہی جیے جاؤں گا

(''چہرۂ ہستی''۔صفحہ 68-69)

یہ واقعاتی نوعیت کی قطعہ بند نظم ہے جو اپنے ہی شہر کے ایک شقاوت زدہ انسان کے بارے میں ہے جو آخرش خود انتقام کا شکار ہوا۔ یہ عبرت آمیز نظم ہے جو اس وقت لکھی گئی تھی جب کہ وہ شخص بسترِ مرگ پر تھا۔تو نے سوچا تھا یا تو یہ سمجھا تھا کا تخاطب اس سے تخاطب کے قرینے ہیں۔

2۔ہماری محبت:

ستاروں کی لو سے منور زمیں ہے
ستاروں سے بڑھ کر ہماری محبت
بہاروں کے دم سے یہ دنیا حسیں ہے
بہاروں سے بڑھ کر ہماری محبت
ہواؤں کی نرمی سے ہلچل ہے دل میں
ہواؤں سے بڑھ کر ہماری محبت
نواؤں کی گرمی سے ہلچل ہے دل میں
نواؤں سے بڑھ کر ہماری محبت
دلوں کے لیے لازمی ہے مسرت
مسرت سے بڑھ کر ہماری محبت
مبرا ہے انکار سے جو صداقت
صداقت سے بڑھ کر ہماری محبت
حقائق اگر تلخ بھی ہوں بجا ہیں
حقائق سے بڑھ کر ہماری محبت
خلائق جو ہر وقت ہیں جا بجا ہیں
خلائق سے بڑھ کر ہماری محبت

گلابوں کی دنیا معطر حسیں ہے
گلابوں سے بڑھ کر ہماری محبت
سحابوں کی رم جھم بہت دل نشیں ہے
سحابوں سے بڑھ کر ہماری محبت

(''چہرۂ ہستی''۔صفحہ 80-81)

بحر متقارب مثمن سالم سے مزین یہ ایک بھرپور رومانوی نظم ہے جو محبت کی مواجیت پر دال ہے۔ اس میں محبت کا تقدس اس کی نفاست و نزاکت اس کی ہمہ گیری اور آفاقیت زیرِ بحث لائی گئی ہے۔مختلف خوب صورت عوامل کی کثرت وافراد سے وفورِ الفت کا تقابل بھی کیا گیا ہے۔نظم ھٰذا میں داخلی قوافی نے بھی مقامات بدل بدل کر ایک عجیب حسن پیدا کر دیا ہے۔کہیں کہیں پہلے اور کہیں کہیں تیسرے مصرع میں ایسی کیفیات لطف پیدا کر رہی ہیں۔

اس کے بعد مخمس کی باری آتی ہے۔ چنانچہ بطور نمونہ اس میں بھی دو منظومات رقم کی جا رہی ہیں۔

1۔دل کی آواز:

ایک کانٹا سا مرے دل میں ہے چبھتا بار بار
فکر ہے اک کاٹے جاتی بن کے تیغ تیز تلوار
ایک اندیشہ دماغ و دل پہ ہے میرے سوار
ہو رہی ہے ایک بے چینی سی، دل ہے بے قرار
آہ نکلا چاہتی ہے قلب سے بے اختیار

ایک غم ہے غفلتِ مسلم کا کھاتا ہے مجھے
قوم کا حالِ پریشاں خوں رلاتا ہے مجھے
انتشارِ ملتِ بیضا ستاتا ہے مجھے
وقت ماتھے پر شکن ڈالے ڈراتا ہے مجھے
قلب میں خوفِ تنزل سے بپا ہے انتشار

ہم کہ تھے مردِ مجاہد، آج بازاری ہوئے

صاحبِ فکر و عمل تھے وقفِ مے کاری ہوئے
حامیٔ باطل بنے اسلام سے عاری ہوئے
حیف ہم حکمِ خداوندی سے انکاری ہوئے
اب ہمارے ہر عمل سے کج روی ہے آشکار

ہم نے ڈھونڈی ہر نئے آئین میں راہِ نجات
اشتراکیت کو سمجھے راہِ بہبودِ حیات
کی کبھی سرمایہ داری پر نگاہِ التفات
ہر قدم پر کھایا دھوکہ ہر قدم پر کھائی مات
یونہی ہم ہوتے رہے ہر دم سرابوں کا شکار

یا الٰہی اب ہمیں تیری ہدایت چاہیے
تیری نصرت چاہیے، تیری عنایت چاہیے
ہم گنہ گاروں کو یارب تیری رحمت چاہیے
پائے لرزاں کو ہمارے استقامت چاہیے
تو ہی فرما دست گیری اے خدائے کردگار

(''تصویرِ کائنات''۔صفحہ 20-21)

ملی وقومی تناظر میں یہ مخمس لکھا گیا ہے۔ فکرِ ملت، غمِ قوم اور دعائے خیر اس کے اجزائے ترکیبی ہیں۔ ایک بھرپور تسلسل اور زبردست روانی اس کا خاصا ہے۔ خود میں ایک حساسیت، جذباتیت اور حبِ قوم کا ملکہ رکھتی ہے۔ عصرِ حاضر میں ایسی نظمیں شاذ ہی منظرِ عام پر آتی ہیں۔

2۔ساحلِ سنگھڑ:

اے ساحلِ سنگھڑ میں بتاؤں تیری کیا شان
تو ٹیلوں کا ہے شاہ، ترا شاہِ سلیمان
ہے ریگ تری جان تو جنڈیاں ہیں تری آن
رہ سکتا نہیں کوئی ترے حسن سے انجان

جو بھی تجھے دیکھے گا ترا ہو گا ثناخوان

اے ساحلِ سنگھڑ تجھے وہ دن بھی ہیں کیا یاد؟
جبکہ تیری اس ارض پہ اک بستی تھی آباد
کچھ لوگ تھے خوش تجھ پہ تو کچھ رہتے تھے ناشاد
دنیا کے تبدل نے انہیں کر دیا برباد
مشہور ہے تاریخ میں بچپن کا وہ طوفان

طوفانِ بلا تھا ہو کوئی دیو کہ جن زاد
جس نے تجھے کر ڈالا عمارات سے آزاد
شیریں ہی رہی تجھ پہ کوئی اور نہ فرہاد
مقتل ہی رہا کوئی نہ مقتول نہ جلاد
تو آنکھ جھپکتے ہی بنا رشکِ بیابان

کیا ہو گئے اب ماضی میں کیا تھے تیرے حالات
کیا چھوڑ گئیں اپنے نشاں تیری عمارات
حیراں ہوئے تبدیلیٔ دنیا پہ سماوات
پھر ریت کے ٹیلوں سے نکل آئے نباتات
انساں نے کسی حال نہ چھوڑا تجھے ویران

بخشی تجھے ہر حال میں انسان نے رونق
بخشی تجھے ہر ایک ہی مہمان نے رونق
بخشی تجھے ہر محفلِ یاران نے رونق
انساں ہی نہیں بخشی ہے حیوان نے رونق
ایفا کیے ہر اک نے وفا کرنے کے پیمان

(جاری)

(''چہرۂ ہستی''۔صفحہ 63-64)

یہ نظم مقامی جغرافیائی حیثیت کی حامل ہے جو خود میں اجمالی تاریخی پس منظر اور منظر نگاری خود میں سموئے ہوئے ہے۔جس میں مرورِ ایام کی عکاسی پائی جاتی ہے۔

مندرجہ بالا دونوں منظومات میں مخمس کی ہیئت پائی جاتی ہے۔پانچواں مصرع ٹی کے مصرعے کا درجہ رکھتا ہے۔اسے ہم ہیئتی چابک دستی کا نام دے سکتے ہیں۔

اب نظمِ معریٰ کی نسبت سے ابوالبیان کی دو نظمیں ہدیۂ قارئین ہیں:

1۔رشکِ گل:

تو گل بدن بھی ہے گلفام بھی ہے گل رخ بھی
ہے گل زمیں کو بہت پیار تیری ہستی سے
بڑی عنایتیں تجھ پر ہیں موسمِ گل کی
اے گل عذار ہیں گل ریز تیری مسکانیں
ہے تیری سنگ زنی میں بھی لطفِ گل باری
تو گل فراش ہے گل پوش و گل بداماں بھی
کنول ہیں نین ترے پھول ہیں لب و عارض
نثار نرگسِ شہلا ہے تیری آنکھوں پر
فدا ہے چنبا چنبیلی تری اداؤں پر
ہے تیرے حسن پہ قربان لالہ و گل بھی
تو گل فروش بھی گل پیرہن بھی لگتا ہے
تو گلستاں ہے میرے گلاب جذبوں کا
تو گل بہار ہے میری گلاب سوچوں کا

(''سنہرے خواب مت دیکھو''۔صفحہ 29-30)

یہ معریٰ نظم بہت سی خوبیاں اپنے دامن میں سموئے ہوئے ہے۔زبان و بیان کے زبردست مشاہدات مشاہدہ کیے جاسکتے ہیں۔عنوان سے لے کر پایان تک گل کی تکرار بڑی دلآویز ہے۔حسنِ یار کو بھرپور خراجِ تحسین پیش کیا گیا ہے۔از آغاز تا اختتام ایک تخاطب کی کیفیت کارفرما ہے۔صنائع بدائع،

استعارات وتمثیلات ہر مصرع میں اپنی شان دکھا رہے ہیں۔اس میں فارسی ادب وزبان کی شیرینی گھلی ہوئی ہے۔

2۔زلفِ عنبریں:

مرے جنوں کوتمنا ہے کالے بادل کی
یہ شرط ہے کہ وہ بادل ہو کالی زلفوں کا
مرے خلوص کومطلوب ہے گھنی چھاؤں
دعا ہے یہ کہ وہ چھاؤں ہو تیری زلفوں کی
مرے خیال کوخواہش ہے ایسی خوشبو کی
تری کھلی ہوئی زلفوں سے جس کو نسبت ہو
اک ایسی رات کی حسرت ہے میرے خوابوں کو
سیاہی زلفوں کی شامل ہو جس کی ظلمت میں
تلاش کرتا ہے رم جھم وہ میرا ذوقِ جمال
ہو زلفِ تر سے ہی منسوب جس کا ہر قطرہ

نظم ھٰذا ایک ایسی معریٰ نظم ہے جو ایک نازک خیال اور دل کش استعاراتی فضا سے معمور ہے۔اس میں جنونِ حسن پرست کی کارستانی پائی جاتی ہے۔ایک ایسا رومان جاگزیں ہے جو شاعر کے احساسِ جمال کا عکاس ہے۔اس میں فلسفۂ محبت کے نفیس مطالبات پائے جاتے ہیں۔خود میں ایک شاندار کلائمکس لیے ہوئے ہے۔

پائینِ شذرہ دو آزاد نظمیں درج کی جارہی ہیں جو اپنی کیفیت کے اعتبار سے بھرپور تاثر کی حامل ہیں۔

1۔اظہارِ جلی:

امیرِ شہر سے کہہ دو، فقیہِ عصر سے کہہ دو
اگر ہے لب کشائی امرِ ممنوعہ
اگر ہے جراتِ گفتار پر قدغن
اگر لازم ہے واجب ہے زباں بندی
نہیں اذنِ تکلم اہلِ دانش کو

ہمیں کوئی نہیں پروا
ہمیں اظہار کا اک اور بھی انداز آتا ہے
وہ اندازِ جلی جو مستند بھی ہے موثر بھی
کہ ہم اہلِ قلم، اہلِ سخن، اہلِ کرامت ہیں
ودیعت ہے ہمیں اشعار کی دنیا کی سلطانی
نہایت قیمتی الفاظ ہیں اپنے خزانے میں
کسی کو کیا خبر، خاصیتیں رکھتے ہیں یہ کیا کیا؟
یہ ہیرے ہیں، یہ موتی ہیں، یہ نیلم ہیں، زمرد ہیں
یہی پکھراج ہیں میرے، یہی یاقوت ہیں میرے
یہ اپنے لالہ وگل ہیں، یہ شبنم ہیں، یہ آنسو ہیں
یہ اپنے چاند تارے ہیں، یہ سورج ہیں، یہ آتش ہیں
یہ تیکھے تیر ہیں نیزے ہیں خنجر ہیں کلاشنکوف ہیں بم ہیں
اگر کچھ شوق شامل ہو، اگر کچھ جوش بھی شامل
اگر کچھ ولولہ بھی ہو تو یہ محشر بپا کر دیں
اگر کچھ کرب ہو ان میں، اگر کچھ درد ہو ان میں
اگر کچھ سوز ہو ان میں تو یہ تڑپا کے رکھ دیں گے
ہمارے لفظ ناطق ہیں، ہمارے لفظ بولیں گے
یہ آفت ہیں، قیامت ہیں، کرشمہ ہیں، کرامت ہیں
یہ جادو ہیں، یہ نغمہ ہیں، یہ ہیں اکتار، زخمہ ہیں
انہیں جب ہم پرو لیں گے ہمارے زخم بولیں گے
جو دکھ ان میں ہے، غم ان میں، کوئی رنج والم ان میں
شرر بن کے یہ چمکیں گے، شرارہ بن کے بولیں گے
نگاہوں کے ذریعے دل میں اتریں گے
ہمارے لفظ بولیں گے

(''ساری بھول ہماری تھی''۔ صفحہ 38-39)

یہ آزاد نظم ایک خالص ادبی آہنگ خود میں لیے ہوئے ہے۔شاعر جو الفاظ کا بازی گر ہوتا ہے، الفاظ سے گہری محبت رکھتا ہے۔شاعر کے الفاظ جب قرطاس پر مرتسم ہوجاتے ہیں تو دوہری تاثیر کے حامل ہو جاتے ہیں۔حاصلِ کلام یہ ہے کہ اگر ہمیں اذنِ گفتگو نہ بھی دیا جائے تو ہمیں مطلق پروا نہیں ہوتی کیونکہ اس صورت میں ہمارے لفظ جو مختلف روپ دھار لیتے ہیں، اہمیت و تاثیر کے اعتبار سے کئی گنا زیادہ ہوتے ہیں۔جن میں لعل و جواہر کی سی قدر و قیمت ،گل و شبنم کی سی نزاکت، چنگ و رباب کی سی موسیقیت، ماہ و انجم کی سی نور افشانی ،شمس و برق جیسی ضو ریزی اور تیر و تفنگ کی سی تیزی پیدا ہو جاتی ہے۔ جیسے میر تقی میرؔ نے ایک والیء ریاست سے اپنا تعارف کچھ یوں کرایا تھا۔

’’ہم اقلیمِ سخن کے شہنشاہ ہیں۔الفاظ ہمارے باج گزار ہیں۔ جو ہمہ وقت ہمارے روبرو دست بستہ سرِ تسلیم خم کیے رہتے ہیں۔ہم جنھیں چاہیں خدمت کا شرف بخشیں یا اعراض برتیں۔‘‘

ابوالبیان ظہور احمد فاتح کی یہ نظم اسی بیان کا پرتو محسوس ہوتی ہے۔

2۔محسوسات:

وہ دیکھتا ہے جو میری جانب
تو ایسا لگتا ہے اک زمانہ مری طرف ملتفت ہوا ہے
وہ دیکھتا ہے جو میری جانب
تو ایسا لگتا ہے میں اک طلسمی فضا میں تحلیل ہو رہا ہوں
عجب تجاذب ہے مقناطیسی میں جس میں تحویل ہو رہا ہوں
وہ دیکھتا ہے جو میری جانب
تو ایسا لگتا ہے چشمِ نرگس مجھے فسانے سنا رہی ہے رفاقتوں کے
کنول سی آنکھیں عجب مناظر دکھا رہی ہیں صباحتوں کے
وہ مدھ بھرے نین مجھ کو ساغر پلا رہے ہیں محبتوں کے

وہ مجھ سے ہوتا ہے جب مخاطب
تو ایسا لگتا ہے میرے کانوں میں گھنٹیاں جیسے بج رہی ہوں
وہ بولتا ہے تو ایک امرت سا گھولتا ہے
صدائے فردوش گوش اس کے سنوں تو میری سماعتوں کو لگے

کہ بجنے لگا مدھر جل ترنگ کوئی، ستار کے ساتھ چنگ کوئی
مغنیہ سنگ سنگ کوئی بڑھا رہی ہو امنگ کوئی
ہنسے تو اس نقرئی ہنسی سے
سرور پائے مری سماعت، ملے پیامِ حیات و فرحت
فروغ پا جائے سوزِ الفت، مزید ہو انبساط و راحت

(''ساری بھول ہماری تھی''۔صفحہ 57-58)

یہ نظمِ آزاد حسبِ عنوان خود میں احساسات کی گہرائی و گیرائی رکھتی ہے جس میں ایک گونہ تحیر بھی موجود ہے۔ جذبات کی کارفرمائی بھی ہے اور آرزوؤں کا تموج بھی ہے۔ قاری نظم کے تسلسل میں کھو کر رہ جاتی ہے۔ شاعر کی طبعِ خلاق کا منہ بولتا کرشمہ ہے۔

مندرجہ بالا منظومات کی اقسام سے یہ امر بخوبی پایۂ ثبوت کو پہنچ جاتا ہے کہ ابوالبیان ظہور احمد فاتح ایک ایسے قادرالکلام شاعر ہیں جو جملہ اصناف میں یکساں سہولت سے شعر کہنے کی صلاحیت رکھتے ہیں اور ان کے تمام تر ہیئتی تجربے ان کے مختلف مجموعہ ہائے کلام میں لالہ و گل کی طرح آراستہ و پیراستہ ہیں۔

ابوالبیان ظہور احمد فاتح کی نظم نگاری کا اجمالی جائزہ

اللہ رب العزت نے بنی نوعِ انسان کو مختلف طبائع پر پیدا کیا ہے۔ کوئی سیاست دان ہے تو کوئی مردِ میدان ہے، کوئی ماہرِ تعلیم ہے تو کوئی ماہرِ تنظیم، کوئی کاشتکار ہے تو کوئی صنعت کار، کوئی گلوکار ہے تو کوئی قلم کار، کوئی شاعر ہے تو کوئی نثر نگار۔ شعرا میں بھی مختلف نوعیات پائی جاتی ہیں۔ کوئی شہ سوارِ غزل ہے تو کوئی فاضل نظم نگار ہے۔ جہاں تک ابوالبیان ظہور احمد فاتح کا تعلق ہے، ان کے بارے ہمیں یہ فیصلہ کرنے میں دشواری پیش آ رہی ہے کہ وہ نظم میں یدِ طولیٰ رکھتے ہیں یا غزل میں انہیں زیادہ دستگاہ حاصل ہے۔ ان کی غزلوں کا مطالعہ کرتے ہیں تو لگتا ہے کہ غزل میں انہیں بھرپور مہارت حاسل ہے لیکن پھر جب ان کی نظم پڑھتے ہیں تو ایسا لگتا ہے کہ انہیں نظم کی دنیا میں تبحر حاصل ہے۔ آج کے شذرے میں ہم ابوالبیان ظہور احمد فاتح کے فحوائے نظم کا اجمالی جائزہ لے رہے ہیں کہ اس میں کون کون سے عناصر کارفرما ہیں۔

سب سے پہلے ہمیں یہ محسوس ہوتا ہے کہ پروفیسر ظہور احمد فاتح کے ہاں مضامین کی زبردست وسعت ہے۔ یوں لگتا ہے کہ ان کے ہاں عنوانات دست بستہ ایستادہ ہیں۔ جس موضوع پر بھی وہ چاہتے ہیں، قلم اٹھا لیتے ہیں اور پھر قلم برداشتہ لکھتے چلے جاتے ہیں۔ جس طرح کوئی ماہر نثر نگار سہولت سے نثر لکھ رہا ہو۔ ان کے ہاں وفورِ شعر اور پر گوئی مسلم ہے۔ اس کا اندازہ آپ اس امر سے لگا سکتے ہیں کہ اردو زبان میں ان کے پندرہ شائع شدہ اور ایک سو دس غیر مطبوعہ شعری مجموعے موجود ہیں۔ اس طرح سرائیکی زبان کے ایک درجن مجموعہ ہائے کلام تشنۂ طباعت ہیں جبکہ ایک سرائیکی مجموعہ ہنوز چھپ سکا ہے۔ وہ شاعرِ ہفت زباں ہیں۔ اردو اور سرائیکی کے علاوہ پنجابی، ہندی، عربی، فارسی اور انگریزی میں طبع آزمائی کرتے ہیں۔ حال

ہی میں ''فلاورز آف لیٹر'' کے نام سے ان کا ایک مجموعۂ کلام منظرِ عام پر آیا ہے۔ اس میں کمال کی بات یہ ہے کہ اردو عروض کی پابندی کرتے ہوئے غزلیں کہی گئی ہیں اور قوافی میں بھی ابجد کا اس طرح لحاظ رکھا گیا ہے جیسے اردو میں رکھا جاتا ہے۔ اسے ہم تحیر العقول تخلیقی کارنامہ قرار دے سکتے ہیں۔

جہاں تک اردو میں وسعتِ مضامین کا تعلق ہے، ان کی تخلیقات شمار سے باہر ہیں۔ موضوع چاہے دینی ہو یا نفسیاتی، پیشہ وارانہ ہو یا سائنسی، عمرانی نقطۂ نظر ہو یا سیاسی، وہ ملی مضامین ہوں یا قومی، وہ جہادی نظمیں ہوں یا مزاحمتی کلام، وہ طنز و مزاح ہو یا بچوں کی شاعری، غرض جملہ احتمالات ان کے امکانی موضوعات ہیں۔ اس گونا گونی کو ہم ان کا نظمیاتی تنوع بھی قرار دے سکتے ہیں۔ اس طرح ہم نے مشاہدہ بھی کیا ہے کہ جنابِ فاتح کے ہاں وسیع تر شعری اعماق و آفاق پائے جاتے ہیں۔

پروفیسر ظہور احمد فاتح کے ہاں عمومی و خصوصی فکری زاویے بڑی کثرت سے نظر آتے ہیں۔ ان کی سوچ کافی دور تک اور بہت گہرائی تک جاتی ہے۔ ہم نے یہ محسوس کیا ہے کہ وہ جس طبقے کی فکر بھی خود پر طاری کرنا چاہیں، بہ آسانی کر لیتے ہیں۔ ان کے ہاں زبردست فکری رچاؤ اور جاذبیت موجود ہے۔ لہٰذا معروضی طور پر وہ ہر کردار کی نمائندگی کرتے ہیں۔ ان کی شاعری خود میں ایک خاص معقولیت کا جوہر سموئے ہوئے ہے۔ کوئی مصرع، کوئی شعر، کہیں بھی ڈھیلے پن میں مبتلا نہیں ہوتا۔ یہ ڈھیلا پن نہ تو فنی اعتبار سے کہیں نظر آتا ہے اور نہ کہیں سوچ میں اس کا عمل دخل ہے بلکہ فکری بالیدگی و فنی پختگی ہر پہلو سے نظر آتی ہے۔ ایک شاعر جتنا بڑا ہوگا، اس کے بیان میں منطقی احتمالات اتنے زیادہ ہوں گے۔ ان کے موضوعات میں وہ کلاسیکی رچاؤ ہے کہ متقدمین و متوسطین کی یاد تازہ ہو جاتی ہے۔ گویا اپنی روایت سے پوری طرح ان کا رشتہ استوار ہے۔

اگر ہم سخنِ فاتح کا اسلوبیاتی جائزہ لیں تو ہر نوعیت کے مظاہر دکھائی دیتے ہیں۔ کہیں ان کی آسان نگاری کہ جس پر سہلِ ممتنع کا گماں ہوتا ہے اور کہیں ایسی دقیقہ سنجی سے کام لیتے ہیں کہ دبستانِ لکھنو کی یاد تازہ ہو جاتی ہے۔ ان کے ہاں شوکتِ الفاظ کے وسیع و عریض میدان دکھائی دیتے ہیں۔ وہ چونکہ شاعرِ ہفت زباں ہیں، لہٰذا لسانیاتی طور پر بہت مضبوط ہیں اور ان کے کلام میں عربی و فارسی تراکیب کی فراوانی ہے۔ لیکن انہوں نے ہندی کو بھی پورا پورا حق دے رکھا ہے۔ جو ان کی لسانی رواداری کی دلیل ہے۔ وہ انتخابِ الفاظ میں زیادہ محتاط تو نہیں تاہم ان کے ہاں اظہارِ بیان کے لیے جچے تلے الفاظ ہمہ وقت دستیاب ہیں۔ ان کی عمومی کوشش رہتی ہے کہ شعر کو بھی نثر کے قریب قریب رقم کیا جائے۔ لہٰذا وہ تعقیدِ لفظی کے قرینے نبھانے میں کبھی سہل انگاری کا مظاہرہ نہیں کرتے۔ ان کے ہاں تقدیمِ لفظی اور معنی آفرینی کا

خصوصی اہتمام ہے۔ کہیں وہ مترادفات کی جوڑیاں بنا رہے ہیں تو کہیں صوتی حسن کا فائدہ اٹھا کر لذتِ کلام کو دوبالا کر رہے ہیں۔ ان کے ہاں رمزیت اور ایمانیت بھی ایک حد تک پائی جاتی ہے جس میں رعایتِ لفظی کے کرشمے اپنی بہار دکھاتے نظر آتے ہیں۔ تاہم قطعیت وحتمیت کو ترجیح دیتے ہیں۔ کلام غیر واضح یا ابہام کو وہ ناپسند کرتے ہیں۔ لہٰذا ہمیشہ اس سے گریزاں رہتے ہیں۔ وہ خود ایک زندہ دل انسان ہیں اور باغ و بہار شخصیت کے مالک ہیں۔ لہٰذا ان کے کلام میں بھی رجائیت اور شگفتگی کی وافر صورتیں پائی جاتی ہیں۔ ابوالبیان ظہور احمد فاتح کی شاعری میں اسلوبِ فعلی اور اسمیاتی دونوں نظیریں بکثرت مشاہدہ کی جاسکتی ہیں۔ ہر چند کہ وہ تصنع کے خلاف ہیں لیکن فطری طور پر ان کے ہاں صنائع و بدائع کا نظام کارگر صورت میں ہے۔ وہ روزمرہ ہو کہ محاورہ، ضرب الامثال یا تلمیح، تشبیہ ہو کہ استعارہ، رمز و کنایہ ہو کہ مجازِ مرسل تمام تر نظائر نہایت خوش اسلوبی اور غیر مصنوعی انداز میں بطور سوغات پائے جاتے ہیں۔ وہ بات کو پھیلانے اور سمیٹنے کے سلیقے سے آگاہ ہیں۔ ان کا راہوارِ سخن بخوبی جانتا ہے کہ کہاں ایجاز و اختصار سے کام لینا ہے اور کہاں شرح و بسط سے مرقوم کرنا ہے۔ وہ اپنے سخن میں ابلاغیت کو بنیادی حیثیت دیتے ہیں۔ چاہے اس کے لیے انہیں ثقیل یا غیر مانوس لفظیات سے بھی کام لینا پڑے تو گریز نہیں کرتے کیونکہ ان کے ہاں مقصدیت کو اولیت حاصل ہے۔

جنابِ فاتح موقع محل کی نسبت سے اسلوبِ نگارش اختیار کرتے ہیں اور اسی کی نسبت سے آہنگ اختیار کرتے ہیں۔ یعنی ایک نظم کے حسبِ حال جیسی بحر مناسب رہتی ہے۔ اسے اس میں برتنے کا التزام کرتے ہیں۔ مثلاً رزمیہ کے لیے بحر رجز، طربیہ کے لیے تموج آمیز سخن جیسی بحر رمل، ترانے کے لیے شوکتِ الفاظ اور حزنیہ کے لیے نرم و گداز الفاظ بروئے کار لاتے ہیں۔ جس موضوع کے لیے مثنوی موزوں ہو، اسے مثنوی میں ہی لکھتے ہیں۔ خصوصاً واقعاتی منظومات اسی ذیل میں آتی ہیں لیکن جہاں وہ محسوس کرتے ہیں کہ یہاں قطعہ بند یا مخمس بہتر رہے گی، وہاں اس کو زیرِ استعمال لاتے ہیں۔ وہ روایت سے محبت ضرور کرتے ہیں جو ان کی افتادِ طبع کا فطری تقاضا ہے تاہم عصری تقاضوں کا ساتھ دینے سے بھی پیچھے نہیں رہتے چنانچہ ان کی تازہ نظمیں زیادہ تر نظمِ معریٰ یا آزاد نظم کی قبیل سے تعلق رکھتی ہیں کیونکہ یہ اظہار کا بے لاگ ذریعہ ہے۔

وہ اس امر پر یقین رکھتے ہیں کہ مانوس و مروج بحریں ہی ابلاغ کا اچھا ذریعہ ہیں۔ کیونکہ ان سے ادائیگی میں آسانی رہتی ہے اور قاری کو اشعار یاد رکھنے میں بھی کوئی دشواری پیش نہیں آتی۔ وہ ایسے نئے تجربات کرنے سے متامل ہیں کو غیر سلیس اور نامانوس محسوس ہوں۔ لہٰذا عموماً مفرد و مخذوف اور مرکب بحور

ان کے ہاں بکثرت پائی جاتی ہیں۔ وہ استاد الشعرا ہیں۔ لہٰذا موزونیت میں مہارتِ تامہ رکھتے ہیں اور عروضی تلازمات کو بہ حسن وخوبی نبھاتے ہیں۔ ان کے ہاں ایک مضبوط شعری آہنگ پایا جاتا ہے۔ وہ توانا لب و لہجے کے مالک ہیں۔ ان کے سخن میں ہر گاہ تازہ لفظیات شامل ہوتی رہتی ہیں۔ جس سے ان کے قاری کے ہاں ذخیرۂ الفاظ وسیع سے وسیع تر ہوتا جاتا ہے۔ ان کی ہر نظم و ہر شعری کاوش خود میں ایک بھرپور ابلاغ اور ایک معقول آموزش کا سامان رکھتی ہے۔ لہٰذا ان کی دستگاہِ ادب حاتمِ لسانیات ثابت ہوتی ہے۔ وہ رومان آمیز شاعری کثرت سے کرتے ہیں۔ ان کا منتہائے مقصود انسانوں میں مہر و محبت عام کرنا ہے۔ وہ اخلاقیات آموز شاعری کرتے ہیں۔ ان کا مطمۂ نظر نسلِ نو کی تربیت ہے۔ وہ جہادی اور رزمیہ نظمیں لکھتے ہیں تو ان کی تمنا قومی فروغِ مردنی و بصالت کو تقویت بخشنا ہے۔ وہ عرفان و دانش سے معمور کلام لکھتے ہیں تو ان کا مقصد گلزارِ علم و معرفت کی آبیاری ہے۔ غرض وہ ادب میں مقصدیت کو ترجیح دیتے ہیں۔ اگرچہ ان کا حسنِ سخن ادب برائے ادب کا غماز لگتا ہے، وہ اپنے قاری کو ابہام و تحیر میں مبتلا رکھنے کی بجائے تادیب و تہذیب کی کھلی فضا میں لاتے ہیں۔ وہ حسبِ ضرورت فہمائش سے بھی نہیں چوکتے اور قدم قدم پر بصیرت و فراست کے نئے ابواب وا کرتے چلے جاتے ہیں۔ اگرچہ ان کے ہاں جنوں کی کارستانی کی بھی کمی نہیں تاہم ان کا جنوں تعمیری ہے، تخریبی نہیں ہے۔ وہ اپنے راہوارِ جنوں کو مثبت راستوں پر ڈالتے ہیں۔ منفی پگڈنڈیوں پر بھٹکنے کے لیے نہیں چھوڑ دیتے۔ اگر یہ کہا جائے کہ ان کا جنوں باشعور و پاکباز ہے تو بے جا نہ ہوگا۔ وہ شعری استعداد کو خدا کی ایک نعمتِ غیر مترقبہ سمجھتے ہیں، اس پر خدا کے حضور سپاس گزار بھی ہیں۔ اگر وہ محسوس کرتے ہین کہ کسی میں شعری جوہر مخفی ہے تو وہ اسے اجاگر کرنے اور اس کی بازیافت میں پوری کوشش صرف کر دیتے ہیں۔ وہ کسی شائقِ شعر و ادب کو مایوس نہیں کرتے۔ یہی سبب ہے کہ ان کے ہاں کم وبیش ستر تلامذۂ ادب حصولِ فیض میں منسلک ہیں۔ وہ ایک سیال اکادمی کا درجہ رکھتے ہیں۔ اٹھتے بیٹھتے، سوتے جاگتے تاحینِ حیات خود کو ادب کے لیے وقف کر چکے ہیں۔ ان کا موقف ہے:

جی میں آتا ہے کہ فاتح ملکۂ اردو کو ہم
نذر یوں ہی رات دن خونِ جگر کرتے رہیں

وہ کہتے ہیں:

رات جاتی ہے بڑے شوق سے جائے فاتح
آپ کرتے ہی رہیں شعر و ادب کی باتیں

یہی وجہ ہے کہ وہ کارِ تخلیق کو وظیفہء حیات سمجھتے ہیں۔لہٰذا ان کا مقامِ ریاضت بہت بلند ہے۔ان کا مشہور شعر ہے:

ہمیں ریاضِ سخن کے باعث عطا ہوا درجہء ثقابت
جیسے ہوا وجِ سخن کا دعویٰ طلب کرے دستخط ہمارے

اسے محض شاعرانہ تعلّی پر محمول نہ فرمایئے گا بلکہ یہ ایک ادراکِ حقیقت، یہ ایک احساسِ عظمت ہے اور یہ ایک عرفانِ ذات وصفات ہے جو اہلِ عصر کے بیانات سے پیدا ہوتا ہے۔جیسے میرؔ نے کہا تھا:

مستند ہے میرا فرمایا ہوا
سارے عالم پہ ہوں میں چھایا ہوا

یہی وجہ ہے کہ وہ روزانہ کچھ نہ کچھ لکھتے ہیں۔ بڑے وفور سے لکھتے ہیں اور قلم برداشتہ لکھتے چلے جاتے ہیں۔ان کے ہاں اشعار کی تعداد اسی ہزار سے متجاوز ہے اور نگارشات کی تعداد دس ہزار سے زائد ہے۔اگر کبھی حادثاتی طور پر وہ کچھ نہ لکھ سکیں تو ان کے ہاں یہ احساس جنم لیتا ہے:

ایک عرصہ سے کچھ نہیں لکھا
حسِ تخلیق مر نہ جائے کہیں

ایسے سخن ور روز روز پیدا نہیں ہوتے بلکہ صدیوں بعد کہیں رونما ہوتے ہیں۔ان کا اپنا ایک شعر اسی کی ترجمانی کرتا ہے:

مدتوں بعد جنم لیتے ہیں وہ دشت نورد
راستے جن کی کفِ پا سے چمک جاتے ہیں

وماتوفیقی الا باللہ۔

❁❁❁

شبیر ناقدؔ کی تصانیف

شاعری

مطبوعہ:

1۔صلیبِ شعور(غزلیات ونظمیات)	2007ء
2۔من دی مسجد(سرائیکی شاعری)	2010ء
3۔آہنگِ خاطر(غزلیات ونظمیات،گیت،قطعات)	2011ء
4۔جادہ فکر(غزلیات ونظمیات)	2014ء
5۔دل سے دور نہیں ہو تم(غزلیات ونظمیات)	2015ء
6۔صبحِ کاوش (غزلیات،نظمیات)	2015ء
7۔کتابِ وفا(مجموعہ غزل)	2016ء

زیرِ طبع:

8-گنجِ آگہی (مجموعۂ غزل)	زیرِطبع
9۔روح دی روہی (سرائیکی شاعری)	زیرِطبع
10۔جہانِ عقل وجنوں (مجموعۂ غزل)	زیرِطبع
11۔زادِ سخن (غزلیات ونظمیات)	زیرِطبع

تنقید

مطبوعہ:

1-ابوالبیان ظہور احمد فاتح کا کیف غزل (شخصیت اور فن)	2013ء
2-شاعراتِ ارضِ پاک (حصہ اول) تنقیدی مضامین ومنتخب کلام	2013ء
3-شاعراتِ ارضِ پاک حصہ دوم) تنقیدی مضامین ومنتخب کلام	2013ء
4-شاعراتِ ارضِ پاک (حصہ سوم) تنقیدی مضامینو منتخب کلام	2013ء
5-نقدِ فن (تنقیدی مضامین)	2014ء
6-شاعراتِ ارضِ پاک (حصہ چہارم) تنقیدی مضامین ومنتخب کلام	2014ء
7-شاعراتِ ارضِ پاک (حصہ پنجم) تنقیدی مضامین ومنتخب کلام	2015ء
8-شاعراتِ ارضِ پاک (حصہ ششم) تنقیدی مضامین ومنتخب کلام	2015ء
9۔شاعراتِ ارضِ پاک (حصہ ہفتم) تنقیدی مضامین ومنتخب کلام	2016ء
10۔تلمیحاتِ فضا اعظمی (تنقید وتحقیق)	2016ء
11-شاعراتِ ارضِ پاک جامع ایڈیشن (حصہ اول)	2016ء
12۔ابوالبیان ظہور احمد فاتح کا منشورِ نظم (نظمیاتی تجزیہ)	2016ء

زیرِ طبع:

13-میزان تنقید (تنقیدی مضامین)	زیرطبع
14-تنقیدات (تنقیدی مضامین)	زیرطبع
15-توضیحات (تنقیدی مضامین)	زیرطبع
16-زاویے-تنقیدی مضامین	زیرطبع
17۔سفرنامہ نگاری کے انتقادی امکانات (حصہ اول)	زیرِطبع
18۔تناظرات (تنقیدی مضامین)	زیرِطبع
19۔اطلاقی تنقید کی اقدار (تنقیدی مضامین)	زیرِطبع
20۔تجزیات (تنقیدی مضامین)	زیرِطبع

تمت بالخیر